

امتِ مسلمہ کے لیے

سۃ نکاحی لائحہ عمل

اور

”نہی عن المنکر“ کی خصوصی اہمیت

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

امّتِ مسلمہ کے لیے

سۃ نکاتی لائحہ عمل

اور

’نہی عن المنکر‘ کی خصوصی اہمیت

ان

ڈاکٹر اسرار احمد

مع

مجدّد تبلیغ مولانا محمد الیاسؒ کے افکار پر مبنی مولانا اعتدشام الحسن کاندھلوی کی تحریر
اور امیر تبلیغ مولانا محمد لیفؒ کی ایک تحریر



مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰۔ فون : ۵۸۶۹۵۶۔۳

نام کتاب _____ امت مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل

اشاعت اول (اکتوبر ۱۹۹۰ء) _____ ۳۰۰۰

اشاعت دوم (اکتوبر ۱۹۹۵ء) _____ ۲۲۰۰

ناشر _____ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت _____ ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون : ۵۸۶۹۵۰۱-۳

مطبع _____ جی۔ ڈی۔ ایس۔ پرنٹرز،

قیمت (اشاعت خاص : مجلد 'سفید کانڈ') _____ ۶۰ روپے

(اشاعت عام : غیر مجلد 'اخباری کانڈ') _____ ۲۵ روپے

الفتاویٰ

امّتِ مسلمہ کے ان باہمت

افراد

کے نام جو

قرآن حکیم

کو وقعتِ اپنا امام اور رہنما بنانے

کا فیصلہ کر لیں !

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کسبہ

پیش لفظ

زیر نظر تالیف اصلاً محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دو اہم تقاریر پر مشتمل ہے۔ زمانی اعتبار سے اگرچہ دونوں تقاریر کے مابین قریباً ۵۸ سال کا فاصلہ ہے لیکن مضمون کے اعتبار سے دونوں باہم انتہائی مربوط ہیں پہلی تقریر ۱۹۸۵ء کے اوائل میں کراچی کے ایک اجتماع عام میں ’امت مسلمہ کے لیے سرنگاتی لائحہ عمل‘ کے موضوع پر ہوتی تھی جس میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کے حوالے سے مذکورہ بالا موضوع پر مفصل روشنی ڈالی تھی۔ موضوع چونکہ بہت اہم تھا اور خطاب بھی نہایت موثر اور جامع، لہذا ہمارے بزرگ رفیق شیخ جمیل الرحمن صاحب نے اسے بڑی محنت اور دلچسپی سے ٹیپ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جسے چار اقساط میں ماہنامہ ’حکمت قرآن‘ کی زینت بنا دیا گیا۔ بعد میں جب یہ خطاب ’فرہارہ جنگ‘ میں ’الہدیٰ‘ کے زیر عنوان شائع ہوا تو خود محترم ڈاکٹر صاحب نے اس پر نظر ثانی فرما کر اس میں مناسب اصلاح و ترمیم بھی کر دی تھی۔

دوسری تقریر جو اس کتابچے میں شامل ہے، اوائل ۱۹۹۰ء میں ہاشو آڈیو ٹریک میں کراچی میں ہوتی عنوان تھا ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باہمی تعلق اور نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت“۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس خطاب میں آیات قرآنی اور احادیث رسول کی روشنی میں بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے کہ علماء و صلحاء کے کرنے کا اہل کام سہی نہی عن المنکر ہے۔ اس اہم تقریر کو مرتب کر کے ’یشاق‘ کی ماہ اپریل اور ماہ جون کی اشاعتوں میں شائع کیا گیا۔

اضافی طور پر اس کتابچے میں مسلمانوں کی موجودہ ہستی کا واحد علاج کے زیر عنوان مجدد تبلیغ مولانا محمد الیاس کے افکار پر مبنی مولانا احتشام الحسن کا ندھلوی کی ایک اہم تحریر شامل کی گئی ہے۔ اس حد درجہ جامع تحریر کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کتابچے میں شامل دونوں خطابات کے بعض اہم مضامین کا اعادہ ہو جاتا ہے بلکہ ان کے مندرجات کی تصویب و توثیق بھی ہو جاتی ہے۔ مولانا کا ندھلوی کی یہ تحریر جماعت تبلیغ کی معروف کتاب ’تبلیغی نصاب‘ میں شامل ہے۔ چنانچہ ہم نے کتب خانہ شان اسلام اردو بازار کے شائع کردہ ’تبلیغی نصاب‘ جہیز پبلیشن سے اس مضمون کا عکس حاصل کر کے زیر نظر کتاب میں اسے شامل کیا ہے۔

ناظم نشر و اشاعت مرکزی انجمن خدام القرآن

امت مسلمہ کے لیے سُنّہ نکاتی لائحہ عمل

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کو دعوت و رجوع الی القرآن کے اس کام کی جڑ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اس کا حصہ اول چند نہایت جامع اسباق پُرشٹل ہے جن میں انسان کی نجات اور فوز و طلاح کے جملہ لوازم کو نہایت جامعیت کے ساتھ کجا بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسی جامعیت کبریٰ کی حامل ہے سورۃ العصر، پھر یہی شان ہے آیہ بڑی اور اسی جامعیت کا مظہر اتم ہے سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع — قرآن حکیم کا ایک ایسا ہی جامع مقام سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ پُرشٹل ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے بھی سورۃ العصر کی شان کا حامل ہے اور جن اتفاق سے جس طرح سورۃ العصر میں آیات پُرشٹل ہے اسی طرح یہاں بھی تین ہی آیات میں ایک مکمل لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ سورۃ العصر میں بات ایک قاعدہ کلیہ اور حقیقتِ عمومی (UNIVERSAL TRUTH) کے انداز میں بیان ہوتی ہے اور سورۃ آل عمران کے

اس مقام پر خطاب براہِ راست امت مسلمہ سے ہے تو آیت کے پہلے ان آیات کی تلاوت کر لیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

”اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جبنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور کھینچا نہیں
 ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرمانبردار ہو۔ اور چٹ جاؤ اللہ
 کی رسی کے ساتھ مجموعی طور پر اور باہم تفرقہ میں مت پڑو۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو
 جو تم پر ہوئی۔ جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت
 پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے
 بالکل کنارے تک جا پہنچے تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ
 تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا سکو! اور چاہیے کہ تم سے
 ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے
 روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

یہ آیات مبارکہ اس سورت کے قریباً وسط میں واقع ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ سووآل عمران
 دو سو آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات کا نمبر ہے ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴ اور ۱۰۵۔ گویا قریباً وسط ہے میرے
 نزدیک ان آیات میں ہم مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل ہے، اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت میں
 علمی نکات بھی ہیں، حکمت و فلسفہ کے مسائل بھی ہیں اور عملی رہنمائی بھی ہے۔ چنانچہ ان میں بھی یقیناً
 علمی اعتبار سے بڑے وسیع نکات ہیں، لیکن آج میری گفتگو ان کے عملی پہلوؤں کے بیان تک
 محدود رہے گی۔ اس لیے کہ علمی نکات پر توجہ کا ارتکاز زیادہ ہو جاتے تو اکثر و بیشتر عملی رہنمائی کی
 طرف توجہ نہیں ہوتی، لہذا آج میری کوشش یہ ہوگی کہ ان آیات مبارکہ کے مطالعہ سے جو عملی
 لائحہ عمل ہمارے سامنے آتا ہے اُسے میں آپ کے سامنے رکھوں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے قرآن مجید کی تین آیات اس علمی رہنمائی اور ہدایت
 کے اعتبار سے جو وہ اہل ایمان کے سامنے رکھتا ہے قرآن حکیم کے جامع ترین مقامات میں
 سے ہیں۔ امت مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں اور
 اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں! اسے سب سے پہلے کن امور پر اپنی توجہات کو مرکوز کرنا ہوگا
 ان کو بڑی جامعیت کے ساتھ پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت کا موضوع یہ ہے کہ
 ان افراد کو باہم جوڑنے والی چیز، انہیں ایک امت بنانے والی شے، انہیں ”حزب اللہ“ بنانے

والی چیز، ان کے مابین ذہنی و فکری ہم آہنگی اور عملی اتحاد پیدا کرنے والی چیز کون سی ہے!! —
 اور تیسری آیت میں یہ نشاندہی فرمائی گئی کہ اس امت یا حزب اللہ یا اس جماعت کا مقصد کیا ہے!!
 کس کام کے لیے اس کو محنت اور جدوجہد کرنی ہے!

اب آپ غور کر سکتے ہیں کہ ان تین آیات کے مابین بڑا منطقی ربط ہے۔ اس لیے کہ
 بڑی سے بڑی اجتماعیت بھی انفرادی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے کہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

افراد کا رخ درست نہ ہو تو اجتماعیت کا رخ کیسے درست ہو جائے گا! اگر افراد وہ لائحہ عمل اختیار
 نہ کریں جو ان کو دیگیا ہے تو اجتماعی زندگی کے لیے جو صحیح لائحہ عمل ہے، اُسے کیسے اختیار کیا
 جاسکتا ہے! لہذا ترتیب یہی ہے کہ سب سے پہلے ہر فرد اپنے طور پر سوچے کہ مجھے کیا کرنا
 ہے! مجھ سے تقاضا کیا ہے! مجھ سے مطالبہ کیا ہے! میں اس بات کو سمجھانے کے لیے مسجد
 کے منبر کی مثال دیکر تاہوں، چونکہ عام طور پر اس کی تین سیڑھیاں ہوا کرتی ہیں۔ شخص جانتا ہے
 کہ اگر کوئی شخص چھلانگ لگا کر تیسری سیڑھی پر چڑھنا چاہے گا تو اوڑھے منہ گرے گا۔ صحیح
 طریقہ یہی ہے کہ اولاً پہلی سیڑھی پر، پھر دوسری سیڑھی پر اور پھر تیسری سیڑھی پر پہنچنے کی کوشش
 کرے۔ ان آیات میں گویا عملی اعتبار سے یہ تین مراحل ہیں۔ تین سیڑھیاں ہیں جو ہمارے سامنے
 آ رہی ہیں۔

انفرادی لائحہ عمل

اب پہلی آیت پر توجہ مرکوز فرمائیے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ**
وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۱۰ اے اہل ایمان! یا اے ایمان کے دعوے دارو! اللہ
 کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے۔ اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار
 ہو۔ — یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں اور آیتوں پر مشتمل
 ہے، لیکن اس میں آپ کو کہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ زیادہ
 سے زیادہ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں آتے ہیں، لیکن اس سورۃ مبارکہ کے بارے میں

اختلاف ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ میرا خیال یہ ہے کہ سورۃ الحج 'برنخی' سورت ہے۔ اس میں مکی آیات بھی شامل ہیں، مدنی بھی اور سفر ہجرت کے دوران نازل ہونے والی آیات بھی۔ واللہ اعلم! "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" سے خطاب مدنی دور میں شروع ہوا ہے جبکہ ایک امت کی تشکیل بالفعل ہو چکی تھی۔ لہذا امت مسلمہ سے خطاب کے لیے یہ عنوان اختیار کیا گیا، ورنہ اہل ایمان سے خطاب کے لیے سورۃ العنکبوت میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے: "يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا"۔ "اے میرے بندو جو ایمان لائے"۔ یا سورۃ الزمر میں یہ الفاظ مل جائیں گے: "يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ"۔ "اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر گناہ کر کے) زیادتی کی ہے"۔ لیکن "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" کے الفاظ مدنی سورتوں میں کثرت کے ساتھ آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجرات کُل اٹھارہ آیات مشتمل ہے۔ اس میں پانچ آیات کا آغاز "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" سے ہوتا ہے اور دوسری طرف سورۃ الاعراف جو چوبیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور وحجم کے اعتبار سے طویل ترین مکی سورت ہے اس میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ جبکہ آیات کے اعتبار سے سورۃ الشعراء سب سے بڑی مکی سورت ہے جس کی آیات کی تعداد ۲۲۷ ہے۔ لیکن ان طویل مکی سورتوں میں بھی کہیں "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" سے خطاب نہیں ملے گا۔ لہذا پہلی بات تو یہ سمجھیے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" کے الفاظ سے خطاب امت مسلمہ سے ہے اور یہ انداز مخاطب مدنی سورتوں میں نظر آتا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیے کہ سورۃ آل عمران کا غالب حصہ ۳۷ میں نازل ہوا ہے یعنی غزوہ احد کے متصلاً بعد۔ لہذا ۳۷ کے حالات کو اپنے ذہن میں لائیے! مدینہ میں جہاں ایک کثیر تعداد مومنین صادقین کی ہے، جس میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی جن کے متعلق سورۃ توبہ میں فرمایا: "وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ" وہاں ساتھ ہی کچھ ضعیف الایمان لوگ بھی ہیں بلکہ منافقین بھی ہیں۔ یہ گروہ وہاں عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت ہی سے وجود میں آگیا تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تو ایک ہزار افراد آپ کے ساتھ تھے، لیکن پھر عبداللہ بن ابی کے ساتھ تین سو افراد راستہ ہی سے

واپس چلے گئے اور حضورؐ کے ساتھ صرف سات سو افراد رہ گئے۔ اگر وہ تین سو افراد سب کے سب منافق نہیں تھے تب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں منافق بھی تھے اور ضعیف الایمان لوگ بھی تھے اس لیے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں جبکہ یقین سے معلوم ہو کہ جنگ ہو کر رہے گی، ان کے لیے ہلکے سے ہلکے الفاظ ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اُس موقع پر معاملہ گڈ مڈ تھا کہ صادق الایمان لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ تھے، ایسے لوگ کہ جن کے ایمان و یقین کی وسعت و گہرائی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان کی گہرائی اور گیرائی کا ہم کیا تصور کریں گے! وہاں کمزور ایمان اور کمزور قوتِ ارادی والے لوگ بلکہ منافقین بھی موجود تھے۔ لیکن قرآن ان سب سے خطاب کرتا ہے تو 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا' کے الفاظ سے کرتا ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ پورے قرآن مجید میں کہیں 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ نَافَقُوا' نہیں آیا۔ یعنی اے منافقو! کہہ کر کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ جہاں منافقین سے بات ہوتی ہے وہاں بھی 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا' ہی سے ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایمان کے دعوے دار تو وہ (یعنی منافقین) بھی تھے، کلمہ شہادت وہ بھی پڑھتے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نمازیں وہ بھی ادا کرتے تھے، لیکن جب انہیں جنگ کے لیے پکارا جاتا تھا یا جب ان سے اتفاق کا تقاضا ہوتا تھا کہ اللہ کی راہ میں فریضہ کر دیا اللہ کی راہ میں جان بھینسی پر رکھ کر نکلو، تب ان کی جان نکلتی تھی۔ نمازیں وہ پابندی سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ ان کی قلبی کیفیت کے اظہار کے لیے قرآن میں 'كُسَالَى' کا لفظ آیا ہے کہ نماز کے لیے اُٹھتے بھی ہیں تو بڑے کسل کے ساتھ۔ ایک کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ انسان پُوری دل کی آمادگی کے ساتھ اُٹھے، پُورے ذوق و شوق کے ساتھ اُٹھے، جس کا ایک درجہ وہ بھی ہے جسے ایک حدیث مبارک میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا کہ 'وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ' (”اور وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا رہے“) اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جسے لفظ 'كُسَالَى' سے تعبیر فرمایا گیا۔

بہر حال جن آیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں ان میں 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا' سے خطاب ہے۔ چنانچہ اہل ایمان سے پہلا تقاضا کیا گیا: "إِثْقُوا اللَّهَ حَقَّ ثِقَتِهِ"

”اے ایمان کے دعوے دارو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے۔“ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے! بچ کر چلنا، بچو بچو نہ کہ قدم رکھنا، تقویٰ کا اصل مفہوم یہی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: ”اقوه ابا ابن کعب۔“ (صحابہ کرامؓ میں قراوت قرآن کے سب سے بڑے عالم یہ حضرت ابی بن کعب ہیں) ان سے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ”تقویٰ“ کیا ہے! آپ اسے کیسے DEFINE کریں گے؟ تو حضرت ابی بن کعبؓ نے اس لفظ کی بڑی خوبصورت تشریح کی جسے صحابہ کرامؓ کی اس مجلس کے تمام شرکاء نے تسلیم کیا کہ بے شک یہ اس لفظ کی بہترین تعبیر ہے۔ ان کی توضیح کو میں اپنے الفاظ میں بیان کروں تو وہ یہ ہے:

”امیر المؤمنین! جب کسی شخص کو جگل میں ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو، جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سیٹ کر اس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور ان کے کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں تو اس احتیاطی رویے کو تقویٰ کہا جائے گا۔“

اب اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اس آیت پر اپنی توجہات کو مرکوز کیجئے۔ ایمان کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ آپؐ نے توحید کے التزام کے ساتھ اللہ کو مانا، یوم آخرت کا اقرار کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانا۔ اب ان ایمانیات ثلاثہ کا تقاضا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو مانیے! وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ (التغابن: ۱۲) ”اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ صاف صاف پہنچانے کے سوا ہمارے رسولؐ پر کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔“ اور وَمَا أَسْكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَصَحَكُمُ

عَبَهُ فَاَنْهَوْا وَاَتَقُوا اللَّهَ (الحشر: ۷) ”اور جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم دیں اُسے مضبوطی سے
 تھامو اور جس سے روکیں اُس سے رک جاؤ“ آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کیا ہے یہ کہ:
 وَاَتَقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي فَنَسٍ عَنْ فَنَسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
 عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (البقرة: ۱۲۳) ”اور پھر
 اس دن (کی منزل) سے کہ جس دن کوئی شخص کسی کے ذرا بھی کام نہیں آئے گا اور نہ قبول کیا جائے گا اس کی
 طرف سے کوئی فدیہ اور نہ کام آئے گی اس کے حق میں کسی کی سفارش اور نہ کسی کی طرف سے ان کو مدد پہنچے گی“

پس پہلا تقاضا ہے تقویٰ — اگر واقعہ ایمان دل میں ہے تو ہر لفظ زبان سے
 نکالنے سے پہلے انسان سوچے گا کہ میرے اس لفظ سے اللہ راضی ہو گا یا ناراض! میں اس
 کو قیامت کے دن JUSTIFY کر سکوں گا یا نہیں! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے کہنے کا مجھے حق
 حاصل ہے یا نہیں! ہر حرکت جو ہمارے اعضا، وجوہ سے ہو، وہ ہاتھ سے ہو، پاؤں سے
 ہو، یہاں تک کہ آنکھ کی حرکت کی بھی جوابدہی کرنی ہوگی۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے خطاب کر کے
 فرمایا تھا کہ اے علی! کسی نامحرم عورت پر پہلی مرتبہ اچانک نگاہ پڑ جائے تو وہ معاف ہوگی، لیکن
 دوسری مرتبہ اگر نگاہ اٹھی تو وہ معاف نہیں ہے اس لیے کہ یہ انسان کا ارادی عمل ہے معلوم ہوا
 کہ زبان، آنکھ، کان کا ہر ارادی عمل مسئول ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولَئِكَ
 كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل: ۳۶) آپ نے سنا ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ
 تعالیٰ عنہما کا یہ طرز عمل تھا کہ جب کبھی کسی راستہ میں ان کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آتی
 تھی تو فوراً اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور ساتھ چلنے والے سے پوچھتے تھے کہ
 اب تو آواز نہیں آرہی! جب ان کو بتا دیا جاتا تھا کہ آواز نہیں آرہی تب وہ کانوں سے انگلیاں
 نکالتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا پورا وجود، ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ان سب
 کے استعمال میں ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔ زبان کے بارے میں تو حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جہنم میں سب سے
 زیادہ لوگوں کو جھوٹے شے یہ زبان ہے۔ زبان کے غلط استعمال کو حضورؐ نے حصائدُ
 الالسنة قرار دیا ہے، یعنی زبان کی وہ کمیتیاں جو آخرت میں کاٹنی ہوں گی۔ قرآن خبر دیتا ہے
 کہ انسان کوئی لفظ منہ سے نہیں نکال پاتا مگر یہ کہ اس کے پاس ہی ایک ہوشیار نگران تیار رہتا ہے

مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق، ۱۸) پھر یہ کہ ہمارے جوارح و جوارح ہیں ان سے جو حرکت بھی سرزد ہو وہ اس احساس کے تحت ہو کہ مجھے اس کی جولہ ہی کرنی ہوگی اور آخرت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا، ACCOUNT FOR کرنا ہوگا۔ یہ احساس اور یہ روش تقویٰ ہے۔ فرمایا کہ اتنا تقویٰ اختیار کرو جتنا اللہ کے تقویٰ کا حق ہے، اِتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ۔ معمولی تقویٰ مطلوب نہیں ہے بلکہ پوری حدود و قیود کے ساتھ مطلوب ہے۔

”حَقَّ تَقَاتِهِ“ کی شان والا تقویٰ درکار ہے۔ ہم اور آپ تلامذت کرتے وقت اس آیت پر سے سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ یہیں خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کی آیات ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہے! لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پر گہرا گئے، لرز اٹھ گئے کہ کس انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اتنا تقویٰ اختیار کر سکے جتنا اللہ کا حق ہے۔ یہاں تو گویا یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کسی لمحہ بھی کوئی جنبش اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، جبکہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے خطا ہو سکتی ہے کہیں جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں غیر شعوری طور پر، کہیں بھول میں خطا کا صدور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ گہرا گئے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ ہم میں سے کون ہو گا جو اللہ کا ایسا تقویٰ اختیار کر سکے جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور، بڑا رحیم، بڑا رؤف ہے اس نے ان مومنین صادقین کی دل جوئی اور اطمینان کے لیے سورۃ التغابن میں یہ وضاحت فرمائی: فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ ”اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے حذامکان میں ہے۔“ اب صحابہؓ کی جان میں جان آئی کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق تو کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں مغالطہ نہ ہو جائے کہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے کی شعوری کوشش یہ سمجھ کر چھوڑ دی جائے کہ ہم میں اس کی استطاعت ہی نہیں ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کو اس کے تقویٰ کی استطاعت دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گیا کہ مجھ میں فلاں نقص دینی کی بجا آوری کی استعداد و استطاعت ہی نہیں ہے تو جان لیجئے کہ یہ خالص شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ والا معاملہ ہو جائے گا۔

اب اگلے ٹکڑے پر توجہ فرمائیے۔ آیت کا اختتام ہوا ہے ان الفاظ میں کہ پھر:

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا۔ "اور ہرگز موت مرنا مگر اسلام (فرمان برداری) کی حالت میں۔" اسلام کسے کہتے ہیں؟ ہر تسلیم خم کرنے کو۔۔۔ فارسی میں اس کی تعبیر ہوگی لڑون نہادن۔ انگریزی میں اسے TO SURRENDER اور TO SUBMIT کہا جائے گا۔

یعنی کوئی مقابلہ تھا اس میں اگر آپ نے ہتھیار رکھ دیتے اور سپردال دمی تو اس روتیہ کا نام اسلام ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ ہمارا نفس اکثر و بیشتر اللہ سے سرکشی کرتا ہے۔ اللہ کا حکم کچھ ہے نفس کا تقاضا کچھ اور ہے۔ خیر و شر کی کشمکش اور کشاکش انسان کے باطن میں چلتی رہتی ہے، لیکن جب انسان ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ اب جو اللہ کا حکم ہوگا اور اس کے رسول کا حکم ہوگا بجالائیں گے جو ان کا فرمان ہوگا اس کے مطابق عمل کریں گے تو یہ اسلام ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالت اسلام میں" اس کلام میں جو بلاغت ہے اس پر غور فرمائیے کسی انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے کہ وہ کتنی فہلت زندگی لے کر آیا ہے اور اس کی موت کب واقع ہوگی۔ مجھے کوئی پتہ نہیں، ہو سکتا ہے کہ ابھی درس کے بعد مسجد سے سکولوں اور کوئی ایکسٹینٹ ہو جائے اور یہ زندگی ختم ہو جائے۔ آپ کا مشاہدہ ہوگا کہ بسا اوقات صبح لوگ گھر سے اپنے کاروبار کے لیے نکلتے ہیں اور شام کو گھر پر بالاش پہنچتی ہے یا موت کی اطلاع ملتی ہے۔ تو چونکہ موت کا کوئی وقت ہمیں معلوم نہیں لہذا اگر کوئی شخص یہ طے کر لے کہ "میں ہرگز نہیں مروں گا مگر فرمانبرداری کی حالت میں" تو اس کے معنی یہ ہونے کہ اسے ہر لمحہ چوس ہو کر بسر کرنا ہوگا کہ زندگی کا کوئی لمحہ مصیبت میں بسر نہ ہو۔ کیا پتہ موت کا پنج کب آکر دلوچ لے کسی کے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے، کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اسی مصیبت والے لمحہ میں موت نہیں آجائے گی۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے میں آپ کے سامنے ایک حدیث رکھتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور متفق علیہ روایت ہے:

لَا يَذْنِي الزَّانِي حِينَ يَذْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ "کوئی زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی چور ایمان کی حالت میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا۔"

گویا۔ جس وقت وہ عمل کر رہا ہے اس وقت ایمان کی اصل حقیقت اس کے دل سے نکل چکی ہوتی ہے اگرچہ وہ اس مصیبت سے کافر نہیں ہوتا، یہ بات ذہن میں رکھیے! امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف صد فی صد درست ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہو جاتا لیکن وہ قلبی یقین والا ایمان اس وقت موجود نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو زنا کیسے کرے! اگر وہ قلبی ایمان ہو تو چوری کیسے ہو! شراب کیسے پیتے! اب آپ غور کیجئے کہ جس وقت کوئی شخص ان میں سے کوئی کام کر رہا ہے اور عین اس وقت اس کی روح قبض کر لی جائے تو یہ موت کس قدر حسرتناک موت ہوگی۔ یہ فرمانبرداری کی حالت کی موت تو نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس حالت نافرمانی کی موت ہوتی۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ انسان محتاط رہے کہ کوئی بھی لمحہ نافرمانی میں بسر نہ ہو۔

میں یہ عرض کر دوں کہ تقویٰ کے موضوع پر میرے محدود علم کی حد تک قرآن مجید کا سب سے زیادہ تاکید مقام ہی ہے۔ تقویٰ کے ساتھ تو فرمایا: حَقَّ قَسَمٌ لِّعِزَّتِیْ لَاقُولُیْ اِغْتِیَارُ کَرُوْا جَنَّا اللّٰہَ کَا حَقِّ ہُوْا اَرْکَے فرمایا: ”دیکھنا ہرگز موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔“ وَلَا تَمُوْنَنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہ ہے پہلا نکتہ اور یہ ہے پہلی سیڑھی جس پر ہر مسلمان کو مضبوطی سے قدم جمانے کی پُر زور تاکید اور حکم آیا ہے۔ اور اگر یہیں قدم نہیں جمے ہیں تو اگلی بات کرنا بیکار ہے، بلکہ اس صورت میں اگلی بات کرنا ذہنی عیاشی بن جاتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں یہود کے علماء کے بارے میں کہا گیا: اَتَاَمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ط کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو دراصل ایک تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ (البقرہ: ۸۲) یعنی تمہارے پاس تو ریت موجود ہے۔ یطرز عمل جو یہود کے علماء کا تھا ہمیں اپنے معاشرہ میں بھی نظر آ جاتا ہے کہ تفتین بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی ہے، بڑے اعلیٰ مقالات بھی لکھے جا رہے ہیں، بڑی عمدہ تقاریر بھی ہو رہی ہیں لیکن قریب ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں وہ تقویٰ، وہ اسلام، وہ فرمانبرداری کی روش اور وہ حلال و حرام کی پابندی مفقود ہے، حالانکہ ہمارے دین کا بنیادی تقاضا ہر فرد سے یہ ہے کہ وہ لامکانی حد تک تقویٰ اختیار کرے اور اللہ اور رسولؐ کا فرمانبردار بنے۔

بہر حال قرآن کے عطا کردہ سہ نکاتی لائحہ عمل کا پہلا قدم یہ ہے۔ اس سیڑھی پر اپنے

قدموں کو جمانا ضروری ہے۔ اس موضوع پر مزید وقت صرف کیے بغیر میں اس ضمن میں صرف ایک اور بات عرض کروں گا اور وہ یہ کہ ہمارے یہاں بعض اوقات یہ تصور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ خواہ تقویٰ ہو، خواہ اسلام ہو، خواہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرمانبرداری ہو یہ تمام باتیں من حیث الکل مطلوب ہیں۔ یعنی پوری زندگی میں تقویٰ ہے تو حقیقی تقویٰ ہے۔ لیکن اگر معاملہ یہ ہو جائے کہ زندگی کے ایک گوشے میں آپ اللہ کے احکام کی بڑی پابندی کر رہے ہیں مثلاً آپ نے متقیوں کی سی وضع قطع اختیار کر لی ہے لیکن کاروبار میں آپ اسلام کے خلاف طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ ناجائز اور حرام ذرائع اپناتے ہوتے ہیں تو جان لیجئے کہ یہ صورت حال تقویٰ کے منافی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **اَتَقُوْا اللّٰهَ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ**۔ ”اللہ کا تقویٰ اختیار کرو چھپے اور کھلے ہر حال میں“ ایک مرتبہ آپ نے اپنے دست مبارک سے تین بار اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: **التَّقْوَىٰ هُنَا۔ التَّقْوَىٰ هُنَا۔ التَّقْوَىٰ هُنَا**۔ ”تقویٰ یہاں ہوتا ہے“ تقویٰ اگر دل میں ہو گا تو پورے وجود میں سراپت کر جائے گا۔ پھر وہ تقویٰ پوری شخصیت کو اس رنگ میں رنگ دے گا جسے قرآن مجید میں **صَبْغَةُ اللّٰهِ** کہا گیا ہے: **صَبَّغَهُ اللّٰهُ مِّنْ حَسَنٍ مِّنَ اللّٰهِ صَبْغَةً** (البقرہ: ۱۳۸) لیکن اگر ایسا نہیں ہے، صرف ایک جزو میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی ہے اور دیگر معاملات میں آزادی اختیار کی گئی ہے تو یہ دراصل یہود کا ساطر عمل ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ میری امت میں بھی وہ ساری برائیاں پیدا ہوں گی جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے فرمایا کہ ”اگر وہ یعنی بنی اسرائیل گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے۔ یہاں تک الفاظ میں، اگرچہ بیان کرتے ہوئے جھجک پیدا ہوتی ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں تو آپ کو سنا تا ہوں کہ حضور نے فرمایا کہ ”اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا بدبخت پیدا ہوا جس نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو تو تم میں سے بھی کوئی بدبخت ایسا ضرور پیدا ہو گا“

مرا یہ ہے کہ وہ تمام دینی، اعتقادی، فکری، علمی اور عملی غرابیاں جو سابقہ امت (یعنی بنی اسرائیل)

میں پیدا ہوئیں، وہ سب اس امت یعنی امت مسلمہ میں بھی پیدا ہوں گی۔ حدیث کا متن حسب ذیل ہے:

لَيَّا تَيْنَ عَلَى أُمَّتِي كَمَا آتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَدُّو
النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتَّى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ آتَى أُمَّه
عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ۔

”میری امت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے بالکل ایسے جیسے
ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔۔۔۔“

نہایت فصیح و بلیغ تشبیہ ہے۔ جوتی کے ایک جوڑے کو دیکھتے تو چونکہ بچے کا رخ مختلف
ہوتا ہے اس لیے آپ کو بظاہر ایک جوتی دوسری جوتی سے مختلف نظر آنے لگی لیکن ان کے
توؤں کو جوڑتے تو بالکل ایک ہوں گی۔ اسی طرح بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے احوال میں ظاہراً
توفیق موجود ہے اس لیے کہ بہر حال چودہ سو برس کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ ظاہری اعتبار سے کچھ نہ کچھ
فرق ہے لیکن بین السطور دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ سرسُمو کوئی فرق نہیں۔ تو وہ کیفیت جو قرآن مجید
میں یہود کے بارے میں فرمائی گئی، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے گریبان میں خود جھانکنا چاہیے کہ
کہیں ہم تو اس میں مبتلا نہیں ہیں؟ اور کہیں اس آئینہ میں ہیں اپنی صورت تو نظر نہیں آ رہی ہے!
قرآن مجید میں یہود کو مخاطب کر کے فرمایا: أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ؟ ”کیا تم کتاب اور شریعت کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟“ فَمَا جَزَاءُ
مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلاَّ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا — تو کان کھول کر سن لو کہ
”تم میں سے جو کوئی بھی یہ طرز عمل اختیار کرے گا اس کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی
میں ان کو ذلیل و خوار کر دیا جائے“ اور وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ ط
”اور قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا“ (البقرہ: ۸۵) یہ ہے اللہ کی وعید
ان لوگوں کے لیے جو دین کے جیسے بخرے کر لیں کہ زندگی کے ایک حصے میں تو دین پر چلوں گا اور
جو دوسرے گوشے میں تو ان کے لیے عذرات کا پلندہ ہے کہ ابھی کیا کروں؟ یہ تو مجبوری ہے۔
یہ تو زمانے کا چلن ہے۔ یہ تو برادری کا رواج ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات کا مسئلہ تو عورتوں سے متعلق
ہے اس میں ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ کاروبار چل نہیں سکتا جب تک بینکوں سے سودی لین دین نہ ہو۔
کیا کریں! مہنگائی بہت ہے، گزرا مشکل ہے۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ ہے، رشوت نہ لیں تو کام

کیسے چلے گا؟ اب پردے کا رواج کہاں رہا ہے! ہم اپنی خواتین کو پردہ کرائیں گے تو دقیانوس اور رجبت پسند کہلائیں گے۔ یہ بہانے بنا کر ہم نے زندگی کو تقسیم کر لیا ہے کہ ایک حصہ میں تو شریعت کی پابندی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حصہ بہت محدود ہے اور جو دوسرا وسیع تر حصہ ہے وہ شریعت سے آزاد ہے۔ تو قرآن مجید کی رو سے اس پر تبصرہ وہ ہے جو میں نے سورۃ البقرہ کی آیت کے حوالہ سے ابھی آپ کو سنایا ہے۔

نکتہ دوم: حیاتِ ملی کا استحکام

اب آیت دوسری آیت پر۔ وہ لوگ جو پہلی آیت کے تقاضوں — تقویٰ اور اسلام پر کسی نہ کسی درجے میں عمل کر رہے ہوں — میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کر چکے ہوں۔ اس لیے کہ انسان موت تک کبھی یہ طے نہیں کر سکے گا کہ میں یہ تقاضے پورے کر چکا ہوں۔ کون شخص یہ دعویٰ کر سکے گا کہ میں نے اللہ کا اتنا تقویٰ اختیار کر لیا جتنا کہ اس کا حق ہے۔ کوئی انسان اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جب صحابہ کرامؓ گھبرا گئے تو ہم میں سے کون ہو گا جو اس کی جرأت کر سکے۔ لہذا جو اس پر عمل کے لیے کوشاں ہوں، اس کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہوں، اب ان کو آپس میں جڑنا چاہیے، اس لیے کہ جب تک وہ آپس میں مربوط نہیں ہوں گے، بنیان مرصوص نہیں بنیں گے، اس وقت تک وہ دنیا میں کوئی موثر اور نتیجہ خیز کام نہیں کر سکتے۔ آپ کو کوئی بھی چھوٹا بڑا کام کرنا ہو، خواہ وہ بھلائی کا ہو یا بُرائی کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر ہے۔ اب بات سمجھانے کے لیے ایک مثال پیش کر رہا ہوں کہ جو لوگ جیب کا ٹپنے کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کا بھی اگر اپنا ایک جھنڈ نہ ہو، ایک گروہ نہ ہو، اُن کا کوئی گروہ نہ ہو اور وہ شہر کے علاقے ان کے امین تقسیم نہ کرتا ہو، روزانہ سارے جیب کترے اپنی کمائی لے جا کر اس کے قدموں میں نہ ڈال دیتے ہوں تو یہ پیشہ بھی ”کامیابی“ سے نہیں چل سکتا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا بڑا مضبوط جھنڈ ہوتا ہے اور اس میں بڑا سخت نظم ہوتا ہے، ورنہ وہ کیسے بڑے بڑے ڈاکے ڈال سکیں گے! پس معلوم ہوا کہ کوئی کام چاہے خیر کا ہو خواہ شر کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر

ہے اور اس کے کارکنوں کا باہم مربوط ہونا لازم ہے۔ خیر کا سب سے عظیم کام وہ ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا۔ میں اس کا ذکر آگے کروں گا۔ اس کام کے لیے ظاہر بات ہے کہ اجتماعیت کی ضرورت ہے لیکن جس طرح کسی فیصل کے لیے پختہ اینٹ کی ضرورت ہے۔ آپ نا پختہ اینٹ کو لگادیں تو دیوار کمزور رہے گی، لہذا پہلی چیز کیا ضروری ہے؟ یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو۔ اب انسانی اجتماعیت میں اینٹ کی جگہ فرد کو متصور کیجئے۔ مسلم اجتماعیت کی ہر اینٹ کی پہنچ کا پروگرام تو پہلی آیت میں آچکا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ**۔ اب ان اینٹوں کو باہم جوڑنا ہے۔ خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو جوڑنے والا سالہ کونسا ہے! اس کا جواب ہے اس دوسری آیت میں: **وَاغْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ ”اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی کو سب مل جل کر اور جمع ہو کر“ یا اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ ”پوری کی پوری رسی کو“ اس لیے کہ یہاں ”جَمِيعًا“ حال ہے۔ کس کے لیے حال ہے! تو ایک صورت تو یہ ہے کہ جن کو حکم دیا جا رہا ہے وہ سب کے سب مل جل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور دوسری یہ کہ پوری رسی کو تھامیں۔ اس کے کسی ایک جزو کو نہیں۔ اب یہ رسی کون سی ہے! یہ ہے اصل سوال۔ یہاں قرآن مجید کے اصولوں میں سے ایک اصول کو جان لیجئے! اگر قرآن مجید میں کوئی ایسا لفظ یا حکم آگیا ہے جس کی وضاحت درکار ہے تو پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تشریح کر دیتا ہے۔ مفسرین کے یہاں یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ: **الْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا** قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کر دیتا ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں دوسری جگہ اس کی توضیح نہیں ملی۔ اب قرآن مجید کو سمجھنے کا دوسرا ذریعہ کیا ہے؟ وہ ہے سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں یہ فرمایا ہے کہ اے نبی! یہ آپ کا فرض منصبی ہے کہ جو کتاب ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں آپ اس کی وضاحت فرمائیں: **وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ**۔ ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ الذکر، یہ کتاب، یہ قرآن، یہ نصیحت آپ پر نازل کی گئی ہے تاکہ آپ اس کی تبین کریں، اس کی وضاحت کریں ان لوگوں کے لیے جن کیلئے

اسے ہم نے اتارا ہے۔ لہذا ہمارا دوسرا طریقہ کیا ہوگا! یہ کہ سنت و حدیث رسولؐ کی طرف رجوع کریں کہ یہاں جو 'حبل اللہ' فرمایا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے! مجھے ان حضرات سے اختلاف ہے جنہوں نے اس کے معنی خود معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ اگر حبل اللہ کا مفہوم احادیث میں نہ ہوتا اور وہ احادیث مرفوع نہ ہوتیں یا سند کے اعتبار سے مضبوط نہ ہوتیں تب تو معاملہ دوسرا ہو سکتا تھا لیکن جہاں ہیں مرفوع حدیث مل جاتے اور وہ ثقہ ہو، مضبوط ہو، مستند ہو، روایت کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو تو پھر اس کے بعد اپنا قول لگانے کی کوشش کرنا، اپنا فلسفہ بیان کرنا، میرے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہو جائے گی۔ جہاں کوئی چیز نہیں ملی وہاں آپ غور کیجئے، اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا دیتے لیکن جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مل جاتے وہاں اپنی عقل، اپنی سوچ اور محض لغوی معنوں پر بحث میرے نزدیک غلط ہے۔ اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو حضور کی تین احادیث سنا دیتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حبل اللہ' کا کیا مفہوم و مطلب معین فرمایا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت و فضیلت کے بارے میں ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس میں حضورؐ نے قرآن کے بارے میں فرمایا: **هُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ**۔ "یہ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے۔" (ترمذی و دارمی)

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: **قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْقُرْآنُ حَبْلُ اللَّهِ الْمَمْدُودُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ"**۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔"

تیسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر ابن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور بڑی ہی پیاری حدیث ہے۔ اس کے اندر جو تفصیل آئی ہے وہ ایسی ہے کہ جس کو سن کر حق پرستی دیر کے لیے انسان اپنے آپ کو دوزخ نبوی کے ماحول میں موجود محسوس کرنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے برآمد ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ مسجد نبوی کے ایک گوشے میں چند صحابہ بیٹھے ہوئے ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں اور آپس میں سمجھ سمجھا رہے ہیں۔ گویا قرآن مجید

کا مذکر ہو رہا ہے۔ حضورؐ کے چہرہ مبارک پر ثبابت کے آثار نمایاں ہوئے۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لاتے اور ان سے ایک عجیب سوال کیا۔ آج آپؐ حضرات بھی یہ سوال اپنے آپ سے کیجئے اور پھر سوچئے کہ جو جواب صحابہ کرامؓ نے دیا تھا کیا وہ جواب ہم بھی اپنے قلب کی گہرائی سے دے سکتے ہیں! سوال کیا تھا: "اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَاَتَى رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟" "کیا تم بات کے گواہ نہیں ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور یہ کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟ صحابہ کرامؓ کا جواب تھا: بلیٰ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ "یقیناً اے اللہ کے رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم بھی قلب کی گہرائی سے یہی گواہی دے سکیں۔ اپنی زبان کی نوک سے تو ہم سب اس کی گواہی دیتے ہیں کہ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، لیکن جب یہ گواہی ہمارے قلب کی گہرائی سے اُبھرے تب بے اصل گواہی جس کے لیے اقبال نے کہا ہے کہ رے

خرو نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں!

اور ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی"

صلی اللہ علیہ وسلم۔ بہر حال جب صحابہؓ نے یہ جواب دیا: "بلیٰ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" تب حضورؐ نے فرمایا: "فَابْشِرُوْا حَیْنَ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهُ بِیَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهُ بِاَیْدِیْكُمْ فَمَتَّسِكُوْا بِهٖ فَانْكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا۔" "تو اب خوشیاں مناؤ۔ اس لیے کہ قرآن کا ایک سر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سر تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم اس کے بعد کبھی ہلاک ہو گے اور نہ گمراہ۔ اب بتائیے کہ ان تین احادیث کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہے؟ کیا جبل اللہ کا مفہوم قرآن مجید کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بعد میرا کسی اور کا، کسے باشد، یہ حق تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جبل اللہ کا کوئی

دوسرا مفہوم بیان کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر معین فرمایا کہ جبل اللہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں فارسی میں کہا ہے کہ

از یک آئینی مسلمان زندہ است

پیچر ملت ز قرآن زندہ است

ماہم خاک و دل آگاہ اوست

اعتصامش کن کہ جبل اللہ اوست

یعنی مسلمانوں کی حیات ملی اور ہستی اجتماعی کا کل دار و مدار قرآن پر ہے جس سے انہیں ایک قانون اور آئین میسر آتا ہے۔ ہم سب یعنی جملہ اعضائے جسدِ ملی تو خاک کے مانند ہیں، اس جسدِ خاکی میں قلب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔ پس اے مسلمان اسے مضبوطی سے تھام لے اس لیے کہ جبل اللہ یہی ہے!

پس ایک اور علی نکتہ یہ ہوا کہ: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا!**
اللہ کی اس رسی یعنی قرآن مجید سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ عربی میں عصمت کہتے ہیں حفاظت کو۔ اور اعتصام کے معنی ہوں گے اپنی حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ کسی چھوٹے بچے کا تصور کیجئے۔ اگر کسی وقت اُسے کسی طرف سے کوئی اندیشہ ہو، خطرہ ہو، کوئی خوف ہو تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ بے اختیار اپنی ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے اور اس کے سینہ سے چمٹ جاتا ہے۔ اس کے ذہن کی جو چھوٹی سی دنیا ہے اور اس کا جو چھوٹا سا پیما نہ ہے اس کے مطابق ماں کے سینہ سے چمٹ کر وہ سمجھتا ہے کہ میں قلعہ میں آگیا ہوں۔ اب مجھے پوری حفاظت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ کوئی شقی القلب انسان بچے کو ماں کی گود سے چھینے، اس کو اچھالے اور نیزے کی آئی میں پرودے، جیسا کہ قیام پاکستان کے فسادات کے وقت اور شہر میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے سانحہ کے موقع پر عملاً ہو چکا ہے۔ بہر حال اعتصام کا مفہوم ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ چنانچہ فرمایا: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا!**۔ اس قرآن مجید کو، اللہ کی اس رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اس کے ساتھ مل جل کر چمٹ جاؤ یا پورے کے پورے قرآن

کو تھا مو، ادھورے کو نہیں۔ ادھورے کو تھا مو کے تو وہی بات ہو جاتے گی جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی ”اَقْتُوْهُنَّوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ“ — ”کیا تم کتاب الہی کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟“ — ”جیسعاً“ کے لفظ میں یہ دونوں منہا ہم شامل ہیں کہ بل جمل کر قرآن کو تھا مو، اس سے چپٹ جاؤ اور یہ کہ پورے کے پورے قرآن کو تھا مو، اس کے ایک حصے اور جزو کو نہیں۔ اسی کو نوکد کیا گیا یہ فرما کر کہ وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور اس معاملہ میں تفرقہ میں نہ پڑ جانا۔

اس کے بعد اس دور سے جس میں قرآن مجید نازل ہو رہا تھا ایک تاریخی گواہی پیش کی گئی۔ ارشاد فرمایا: ”وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ“ (اے مسلمانو! اور یاد کرو اللہ کا اپنے اوپر احسان اور نعمت) — خطاب کن لوگوں سے ہے اسے ذہن میں رکھیے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے مخاطب ہیں مہاجرین اور انصار — اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءٌ ”جب تم آپس میں دشمن تھے“ فَالْفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ ”پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی“ — فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا۔ ”پس اللہ کے انعام و اکرام سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے“ — مدینہ کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بڑی پرانی دشمنی تھی جس کے نتیجے میں اسلام سے قبل ان میں بڑی خونریزی ہوئی رہی تھیں۔ علاوہ ازیں عرب میں دوسرے قبائل میں بھی بات بات پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ انقض پورے عرب میں بد امنی تھی صرف قریش کو امن حاصل تھا وہ بھی خانہ کعبہ کی بدولت، چونکہ وہ اس کے متوتی تھے۔ ورنہ پورے عرب میں خانہ جنگی تھی۔ ٹوٹ مار، غارت گری اور بد امنی کا بازار گرم تھا۔ اوس اور خزرج کی جس دشمنی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ایک سو سال سے چلی آرہی تھی اور یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کی عداوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے ختم ہو رہے تھے — فرمایا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تشریف لائے۔ اس قرآن نے تمہیں آپس میں جوڑا، تمہیں بنیانِ موصوف بنا دیا۔ ورنہ تمہاری کیفیت اور حالت تو یہ تھی: ”وَ كُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ“ ”اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے تک جا پہنچے تھے“ اس میں گر کر تباہ ہو جانے والے تھے۔ فَانْقَضَتْ مِنْهَا ”تو اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ بلکہ اس کی ترجمانی یہ ہوگی کہ گویا آگ کے اس گڑھے

سے نکال لیا۔ تم آدھے گر چکے تھے۔ اس نے تمہارا دامن پکڑ کر تمہیں کھینچ لیا۔ اس آیت کا اہتمام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ”كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ“ یعنی ”اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو۔“

آگے بڑھنے سے پہلے اگر ہم اس آیت مبارکہ میں بیان شدہ تاریخی واقعہ کے حوالے سے ملت اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے لیں تو ایک جانب تو یہ حقیقت مزید برہن ہوگی کہ قرآن اللہ کا ابدی اور سرمدی کلام ہے جو اگرچہ نازل تو اب سے چودہ سو برس قبل ہوا تھا لیکن اس کی ہدایت و رہنمائی ہمیشہ کے لیے ہے۔ دوسری جانب ہمیں اس آیت قرآنی میں اپنے موجودہ حالات کی سنگینی کا بھی کما حقہ اندازہ ہو سکے گا۔ — مزید برآں اس امید کی کرن بھی چمکے گی کہ جس طرح اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اُس وقت کی عرب قوم کی کایا پلٹ دی تھی اسی طرح ہمارے حالات میں بھی انقلاب آسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس سُنَّہِ نجاتی لائحہ عمل کو بالفعل اختیار کر لیں جو ان آیات مبارکہ میں سامنے آ رہا ہے!

کون نہیں جانتا کہ پاکستان کا قیام دو قومی نظریے کا مرہون منت تھا، جس کی رُو سے پورے بڑے عظیم ہندوپاک کے مسلمان ایک قوم تھے — گزشتہ چالیس برس میں بجائے اس کے کہ اس قوم میں اتحاد و یگانگت کا رنگ گہرا ہوتا اور پاکستان کے مسلمانوں کی یکجہتی پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے اتحاد کا پیش خیمہ بنتی، صورت واقعہ یہ ہے کہ خود پاکستان میں مسلمان قوم کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی جگہ متعدد نسلی، لسانی اور صوبائی قومیتوں نے لے لی ہے اور صرف تشنّت و انتشار ہی نہیں، باضابطہ قتل و غوریزی اور لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم۔ ان حالات میں کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہمارے دشمن وائیں بائیں گدھول کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ اس لیے کہ خواہ ہم خود تو حال مست یا مال مست رہیں لیکن اغیار کو تو نظر آ رہا ہے کہ ”یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری!“

ان حالات میں آدمی اپنے کاروبار میں اور اپنے ائیر کنڈیشنڈ بنگلہ میں مطمئن اور نچنٹ ہو کر اور پاؤں پھیلا کر مگن رہے اور حال اس شعر کے مصداق ہو جاتے ”اب تو آرام سے گزرتی ہے — عاقبت کی خبر خدا جانے“ — تو اس طرح وہ خطرات تو نہیں ٹل سکتے جو ہمارے

سروں پر منڈلا رہے ہیں اور — اگر ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اس سے خطرہ تو ٹل نہیں جاتا۔ اگر ہمارے یہی بچن رہے کہ ”اِنَّهٗ كَانَ فِيْ اَهْلِهٖ مَسُوْرًا“ (الانشقاق: ۳) ہم اپنے اہل و عیال، اپنے کاروبار، اپنے عیش و آرام ہی میں مگن رہیں تو دوسری بات ہے لیکن اگر حالات کو چشم بصیرت سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس آیت مبارکہ کے یہ الفاظ ہماری موجودہ کیفیات پر بالکل منطبق ہو رہے ہیں کہ: ”وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ“ اس لیے کہ جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے قرآن مجید ہمارے لیے ابدی رہنمائی لے کر آیا ہے۔ لہذا قرآن حکیم میں تدریس کے نتیجے میں ہر قسم کے حالات کیفیات اور واقعات کے لیے ہمارے سامنے عملی رہنمائی آجاتی ہے۔ جیسے ہم ختم قرآن کی دعائیں کہتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَ دُوْرًا وَ هُدًى وَ رَحْمَةً اے اللہ اس قرآن کو ہمارا امام بنادے، اسے ہمارے لیے نور بنادے، اسے ہمارے لیے رہنمائی بنادے، اسے ہمارے لیے رحمت بنادے، لیکن یہ صرف کہنے سے تو نہیں ہوگا۔ اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا، اس قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا۔ یہ ہے اس لائحہ عمل کا دوسرا نکتہ جو ان آیات مبارکہ کے مطالعہ کے حاصل کے طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔

گویا — پہلا نکتہ ہے تقویٰ اور اسلام۔ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِهٖ یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا۔ طبعاً اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنا بھی شامل ہے، چونکہ رسول کے احکام و حقیقت اللہ ہی کے احکام ہوتے ہیں اور رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے لہذا اے ارشاداتِ ربانہ: ”مَنْ يُطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ“ (النساء: ۸۰) اور ”وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ“ (النساء: ۶۴) اور ”اطِيعُوا اللّٰهَ وَ اطِيعُوا الرَّسُوْلَ“ (النساء: ۵۹) اور اسلام سے مراد ہے فرماں برداری۔ پوری زندگی میں اور ہر لمحہ، ہر لحظہ: وَلَا تَمُوْنُوْنَ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ!

اور — دوسرا نکتہ ہے: اعتصام بالقرآن — ”وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا“ پورے قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھامنا اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑنا۔ یہی بات کہ اعتصام بالقرآن سے مراد کیا ہے تو الحمد للہ اس موضوع پر راقم کا

ایک کتابچہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، لاکھوں کی تعداد میں اُردو، انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی میں طبع ہو کر کم از کم عالم اسلام کے طول و عرض میں پھیل چکا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر حسب صلاحیت و استعداد قرآن کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پر اپنے ایمان اور یقین کو مزید گہرا اور پختہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کی تلاوت کرے جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کو سمجھے اور اس پر غور و فکر کرے جیسے کہ اس پر تدبر کا حق ہے۔ چوتھے یہ کہ اس پر عمل کرے، اپنی انفرادی زندگی میں فی الفور اور اس کے عطا کردہ قانون و آئین کے نفاذ اور نظام عدل و قسط کے قیام کی اجتماعی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے کر، اور پانچویں یہ کہ اس کو دوسروں تک پہنچانے اور اس کے لیے بہترین مساعی کو بروئے کار لائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اس طور پر قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید کر لیں تو اس کے اندر ذہنی و جذباتی ہم آہنگی اور مقصد اور نصب العین کی یکجہتی پیدا ہوگی جس سے تشنّت و انتشار کی موجودہ کیفیت کا فوراً ہو جائے گی اور مسلمان از سر نو بنیانِ مصوص بن جائیں گے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا کہ ”إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَصْنَعُ بِهِ الْآخِرِينَ“ (مسلم عن عمر) یعنی ”اللہ اس قرآن کا دامن تھا منے کے باعث قوموں کو سر بلندی عطا فرمائے گا اور اس کو پس پشت ڈالنے والی قوموں کو ذلیل و خوار کرے گا“ جس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اپنے الہامی اشعار میں کی ہے کہ

خوار از مہجورتی قرآن شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتدہ
در بغل داری کتابِ زندہ

— یعنی اے امتِ مسلمہ و حقیقت تو قرآن سے دُوری کے باعث ذلیل و خوار ہوتی ہے۔ اس ضمن میں گردشِ دوراں کا شکوہ بے بنیاد ہے — اور اے وہ قوم جو زمینِ شبنم کے مانند

گری ہوتی ہے (جسے اغیار پامال کر رہے ہیں) تیری بغل میں اب بھی زندہ کتاب یعنی قرآن مجید موجود ہے۔

الغرض یہ ہیں وہ دو نکات جن پر عمل پیرا ہونے سے ایک انسان انفرادی طور پر ایک بندہ مؤمن بنتا ہے اور پھر ان افراد کے مجموعے سے ایک مضبوط اجتماعیت وجود میں آتی ہے اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس اجتماعیت کے لیے لائحہ عمل کون سا ہے؟ تو اس کا بیان اگلی آیت میں آ رہا ہے اور حُسنِ اتفاق سے یہ اجتماعی لائحہ عمل بھی تین نکات ہی پر مشتمل ہے۔

نکتہ سوم: اجتماعی لائحہ عمل

اب تیسری آیت پر اپنی توجہات کو پوری طرح مرکوز فرمائیے۔ آیت مبارکہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

اس آیت مبارکہ پر غور و فکر کرنے سے قبل بطور مقدمہ ایک اہم بات ذہن نشین فرمائیں ہم نے اب تک ان دو آیات کا مطالعہ کیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا الخ۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ کر سامنے آتی ہے کہ یہاں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ایک اجتماعیت کی متقاضی ہیں اور ان پر اگر خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ واقعتاً عمل کیا جائے تو اس کے نتیجے میں لازماً ایک ”اجتماعیت“ وجود میں آتی ہے۔ اب آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجتماعیت کس مقصد کے لیے درکار ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کوئی چھوٹی سی مجلس بناتے ہیں تو اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بناتے جاتے ہیں۔ لہذا غور و طلب بات یہ ہے کہ ”حبل اللہ“ سے جڑ کر جو جمعیت وجود میں آئے گی اس کا مقصد کیا ہوگا؟

یہ ہے وہ بات جس کی اس آیت میں وضاحت فرمائی گئی کہ: **وَلَتَكُنَّ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** اس آیت کے دو ترجمے کیے گئے ہیں بعض کے نزدیک یہاں ”مِنْ“ بیان یہ ہے اور بعض کے نزدیک تبعیضیہ ہے۔ یہ دونوں لغوی اصطلاحات ہیں۔ ان پر فنی بحث کی بجائے ان سے ترجمہ میں جو فرق واقع ہوتا ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ مقدم الذکر تاویل کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہوگا: ”تم سے ایک ایسی امت وجود میں آئی چاہیے“ اور اگر یہاں ”مِنْ“ کو تبعیضیہ سمجھا جائے تو ترجمہ ہوگا: ”تم میں سے ایک ایسی امت بھی وجود میں آئی چاہیے“ میرے نزدیک یہ دونوں ترجمے صد فیصد درست ہیں مسلمانوں میں اشتراک و اتحاد ہوا اور وہ سب مل کر ایک امت بن جائیں جن کا کام کیا ہو۔ **يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ**۔ یہ تو ہو جانے کی اس ترجمہ کی وضاحت کہ تم سے ایک ایسی امت وجود میں آئی چاہیے جو یہ کام کرے“ لیکن چونکہ اس مضمون کی آیت اسی سورۃ آل عمران میں آگے موجود ہے: **كُنْتُمْ حَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَكُنتُمْ مِّنَ الصَّغِيرَةِ** **يَا لَللَّهِ** ”تم سب امتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے لیے بھیجی گئیں۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو“ لہذا اکثر مفسرین کی رائے میں یہاں ”مِنْ“ بیان یہ نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے یعنی اگر صورت حال یہ ہو جائے کہ پوری امت سو گئی ہو، پوری امت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ رہا ہو، پوری امت اپنے فرض منصبی کو فراموش کر چکی ہو تو اس صورت میں کیا ہونا چاہیے۔

آگے بڑھنے سے قبل بطور جملہ معترضہ ایک بات عرض کرنی ہے۔ بات اگرچہ تلخ ہے لیکن ہے امر واقعہ! اور وہ یہ کہ اگرچہ نظری طور پر ہم دنیا کے تمام مسلمانوں پر امت مسلمہ کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی ایک امت مسلمہ اس وقت دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ فی الواقع یہاں بے شمار قومیں ہیں جن کو مسلم اقوام (MUSLIM NATIONS) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس صدی میں وحدت ملی کا ان سے بڑا حدی خواں کوئی نہیں تھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

اور

ایک ہولمِ حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تاجک کا شغریٰ

لیکن اس صدی کے وحدت ملی کے سب سے بڑے جدی خواں یعنی علامہ اقبال کو بھی اپنے
لیکچرز تشکیلِ جدید الہیات اسلامیہ میں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی اُمتِ مسلمہ
ایک اکائی اور اتحاد کے اعتبار سے موجود نہیں ہے — بلکہ حقیقی یعنی

DE-FACTO

پوزیشن یہ ہے کہ ”مسلمان اقوام“ (MUSLIM NATIONS) موجود ہیں اور یہ بھی آج سے

نصف صدی سے پہلے کی بات تھی۔ اغلباً علامہ کے لیکچرز ۱۹۳۰ء کے ہیں۔ اب تو صورتِ حال

مزید غراب ہو کر نوبت بایں جا رسید کہ کسی مسلمان ملک میں ایک ”قوم“ (NATION) نہیں رہی

بلکہ وہ بھی کئی قومیتوں کے اندر منقسم ہے۔ دنیا میں پاکستانی ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن

آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی بنیاد پر یہاں پانچ قومیتوں کے تصور کو شروع ہی سے اُبھارا جاتا

رہا ہے جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ قومیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش بن گیا اور غیر بنگالی مسلمانوں

کو وہاں تہ تیغ کیا گیا۔ پھر اس موجودہ پاکستان میں کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس کے

اندر صرف ایک قوم آباد ہے۔ کیا بلوچستان میں جہاں بلوچ ہیں وہاں بروہی نہیں ہیں! کیا دہلی

موجود نہیں ہیں، کم از کم تین بڑی قومیں اس ایک صوبے کے اندر رہتی ہیں۔ یہی معاملہ پاکستان کے

بقیہ صوبوں کا ہے — اور تو اور ایک عربی زبان بولنے والے عرب نہ معلوم کتنی قومیتوں

میں منقسم ہیں — تو حقیقت یہی ہے اگرچہ بڑی تلخ ہے کہ آج ”ایک اُمتِ مسلمہ“ بالفعل موجود

نہیں ہے۔ وہ تو ہمارا صرف ایک ذہنی تصور ہے کہ اُمتِ مسلمہ یا اُمتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

فی الواقع اپنا وجود کھتی ہے اور اس ذہنی تصور کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ جو بھی حضور کا کلمہ پڑھتا

ہے وہ حضور کا امتی ہے! یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن غور کیجئے کہ کیا یہ اُمتِ مربوط

ہے؟ کیا اس کی کوئی اجتماعیت ہے؟ کیا اس میں کوئی ڈسپلن ہے؟ کیا اس میں کوئی کسی کا

حکم سننے اور ماننے والا ہے؟ مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسی صورتِ حال موجود

نہیں ہے۔ آج افغانستان میں روسی فوج افغانوں کا قتل عام کر رہی ہے۔ لیکن کیا روسی فوج کے

ساتھ افغان فوج نہیں ہے! کیا وہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگ رہی اور

اپنے ہاتھوں اپنے بھائیوں کے گلے نہیں کاٹ رہی! ایران اور عراق کی جو جنگ ہو رہی ہے کیا یہ مسلمان کہلانے والے دو ملکوں کی جنگ نہیں! تم یہ ہے کہ عراق کی قریباً نصف آبادی اہل تشیع پر مشتمل ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایران کی غالب اور عظیم ترین اکثریت اہل تشیع ہی کی ہے۔ لہذا مذہبی اعتبار سے عراق کی نصف کے قریب آبادی ایران کی ہم مذہب ہے لیکن سات سال ہوئے کو آئے اور یہ جنگ تاحال جاری ہے اور دونوں اطراف سے شدید مالی و جانی نقصان ہو رہا ہے دوسرے مسلم ممالک کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو اس جنگ کو بند کرانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ سنیوں اور شیعوں کا جو مسلح خونیں تصادم لبنان میں ہوا وہ کسی اخبار بین شخص سے پوشیدہ نہیں ہے! وہ مظالم جو کبھی عیسائی ملیشیانے مسلمانوں پر ڈھائے تھے، وہی مظالم شیعوں ملیشیانے فلسطینی پناہ گزینوں کے کمپوں پر ڈھائے ہیں۔

یہ تمام ہنگامے بتا رہے ہیں کہ ایک امت مسلمہ بالفعل کہیں موجود نہیں ہے۔ لہذا ان حالات میں یہ آیت خوب سمجھ میں آتی ہے کہ جب پوری امت سوئی ہوئی ہو، یا مختلف قومیتوں میں بیٹی ہوئی ہو یا اس نے مختلف سمتوں کی طرف اپنے اپنے قبلے بنا لیے ہوں تو ایسی صورت میں اس امت کے اندر کوئی چھوٹی امت لازماً ایسی وجود میں آتی چاہیے جو اس قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہو جو آیت زیر بحث میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ہدایت کیا ہے؟ اس پر گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔ ہو سکتا ہے یہاں بعض لوگ چونکیں کہ یہ بڑی امت کے دائرے کے اندر ”چھوٹی امت“ کا کیا تصور ہے؟

آپ نے ریاست میں ریاست (STATE WITHIN STATE) یا PARTY WITHIN PARTY

کی اصطلاح ضرور سنی ہوگی۔ جو لوگ میری عمر کے ہیں یا مجھ سے بڑے ہیں ان کو معلوم ہو گا کہ کانگریس ایک بہت بڑی پارٹی تھی لیکن اس کا فاروڈ بلاک (FORWARD BLOCK) علیحدہ تھا، جو زیادہ انقلابی طرز فکر کے حامل لوگوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے کانگریس میں شامل ہونے کے باوجود بھاش چندر بوس کی قیادت میں اپنا جداگانہ بلاک بنا رکھا تھا۔ اسی طرح آج جو امت مسلمہ ہے وہ محض ایک نظری حقیقت بن کر رہ گئی ہے جس کی کوئی واقعی حقیقت نہیں ہے۔ تو اس بڑی امت میں ایک چھوٹی امت ایسے لوگوں پر مشتمل وجود میں آئے جنہوں نے کسی نہ کسی درجہ

میں اس سٹیج پر قدم رکھا ہو جس کا حکم پہلی آیت میں آیا تھا۔ یعنی وہ لوگ دولتِ تقویٰ سے مالا مال ہوں۔ میں پھر عرض کر دوں کہ تکمیل کا کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ جو کمی ہو اسے پورا کرنے کی وہ مسلسل کوشش کر رہے ہوں۔ اور پھر یہ کہ انہوں نے دوسری آیت کا تقاضا بھی کسی قدر پورا کیا ہو یعنی انہوں نے اپنے آپ کو قرآن سے منسلک کر لیا ہو۔ اس طرح وہ باہم ایک دوسرے سے مل کر ایک اجتماعی طاقت وجود میں لائیں۔ اس اجتماعیت کا مقصد کیا ہو! اس کے لیے یہاں تین چیزوں کا تعین کیا گیا!

پہلا مقصد ”يَذْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ“ یعنی دعوت الی الخیر۔ نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلانا۔

دوسرا مقصد۔ نیکی اور بھلائی کا حکم۔ ”وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ“

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر کی دعوت اور خیر کا حکم کیا ہے ایک ہی چیز ہے جس کا اعادہ کیا جا رہا ہے! معاذ اللہ، قرآن مجید میں کسی ایک ہی مقام پر اس طرح کا اعادہ جو حکم انھیں کئے ضمن میں آئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں ”دعوت الی الخیر“ اور ”امر بالمعروف“ کے مصداق کا الگ الگ تعین کرنا ہو گا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد قرآن کی طرف دعوت ہے۔ چونکہ قرآن کی رو سے سب سے بڑا خیر خود قرآن مجید ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ یونس کی آیات ۵۷ اور ۵۸ میں قرآن مجید نے نہایت پر شکوہ اسلوب سے اپنی عظمت کو بیان کیا ہے۔ مؤخر الذکر آیت کے آخر میں قرآن اپنے متعلق کہتا ہے: ”هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ“ یعنی ”یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ (قرآن) ان سب سے بہتر ہے۔“ قرآن مجید دنیوی دولت کو بھی خیر کہتا ہے مثلاً ”سورة العاديت میں فرمایا: ”وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ“ یعنی ”انسان مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے۔“ لیکن سورۃ یونس میں قرآن اپنے لیے کہتا ہے کہ جو کچھ بھی تم دنیوی مال و اسباب جمع کرتے ہو ان سب سے کہیں قیمتی شے خود قرآن ہے۔ ”هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ“ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد ہے قرآن مجید کی طرف دعوت! اور امر بالمعروف اب عام ہو جائے گا۔ نیکی، بھلائی، خیر کی تلقین کرنا، اس کی وضاحت کرنا، اس کا شور و دنیا، اس کا حکم دینا۔ ”امو“ کے لفظ میں یہ تمام مفہام موجود ہیں۔ پہلا امکان اور فرق تو یہ ہے۔

دُعوت الی الخیر اور امر بالمعروف کے مصداقات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ دعوت میں حکمائہ انداز بالکل نہیں ہوتا۔ دعوت میں صرف تلقین ہوتی ہے، نصیحت ہوتی ہے بلکہ خوشابہ بھی ہوتی ہے کہ خدا کے لیے یہ کام بُرا ہے اسے چھوڑ دیجئے اور بھائی یہ کام اچھا ہے، آئیے اور اس کو کیجئے۔ اس انداز اور طریقہ سے آپ لوگوں کو بلاتے ہیں کہ اگر آپ یہ کام کریں گے تو آپ کو آخرت میں یہ اجر و ثواب ملے گا۔ دعوت کا درحقیقت یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں حکمائہ انداز نہیں ہوا کرتا۔ لہذا یہاں علیحدہ کر دیا گیا: ”يَذْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ“ خیر کی طرف بلاؤ، بڑی نرمی سے بلاؤ، غیر خواہی کے جذبہ سے بلاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) سے فرمایا گیا تھا: ”اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَٰدُّكُمَا أَوْ يَخْشَىٰ“ ۝ دونوں جلیل القدر پیغمبروں کو حکم دیا گیا کہ ”فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے“ فرعون کون ہے! دشمن خدا اور خود خدائی کا مدعی، مگر حکم دیا جا رہا ہے کہ ”لیکن اس سے نرم انداز سے بات کرنا، سختی کا انداز اختیار نہ کرنا، شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اس کے دل میں بات اتر ہی جائے“ (سورۃ طہ: ۴۳-۴۴) — تو یہ ہے دعوت کا انداز لیکن اس سے آگے کا قدم ہے ”امر بالمعروف“ یعنی نیکی کا حکم دینا — غور کیجئے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے کب وارد ہوئی! سورۃ الحج میں جب اہل ایمان کو ممکن فی الارض کی نوید سنائی گئی: ”الَّذِينَ اِنْ مَكَثْتُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَامْرُؤًا بِالْعُرْوَفِ وَنَهَمُوا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۱)“ یعنی ”یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم زمین میں ممکن عطا کر دیں، (اقتدار بخش دیں) تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے“ — یہاں تحکم کا انداز ہے نیکی کو قوت اور طاقت کے ساتھ رائج کرنا، نافذ کرنا — یہ ہے دراصل دعوت سے اگلا قدم!

اب تیسری بات پر آئیے جو بدقسمتی سے ہمارے بہت نیک لوگوں کے ذہن سے بھی آج بالکل خارج ہو چکی ہے۔ وہ بات ہے: ”نہی عن المنکر“ یعنی بدی سے روکنا — ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس بھلائی کی تلقین سے کام چل جائے گا۔ صرف نیکی کا وعظ کہنے سے بات

بن جائے گی۔ حالانکہ میں قرآن مجید کے کم از کم نوائے مقامات کا حوالہ دے سکتا ہوں جہاں گاڑی کے دو پہیوں کی طرح یہ دونوں اصطلاحات بالکل ساتھ ساتھ اور جوڑے کی شکل میں آتی ہیں مثلاً: "وَأَمْرًا بِالْعُرْوَةِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو۔ (لقمان: ۱۷) بدی سے روکنا کتنا اہم ہے اس کو دو حدیثوں سے سمجھیے۔ میں وقت کی کمی کے باعث صرف مختصر تشریح پر اکتفا کروں گا۔ یہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں، صحیح مسلم کا کتب احادیث میں کیا مقام ہے! اسے بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ تمام ذی شعور مسلمان صحیح مسلم کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہوں گے۔

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مجھے توقع ہے کہ یہ حدیث آپ میں سے اکثر نے سنی ہوگی۔ لہذا اس کا تو صرف تن کے ساتھ ترجمہ کر دوں گا لیکن دوسری حدیث اس قدر زیادہ عام نہیں ہے، حالانکہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور فقہ حنفی دراصل فقہ عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہے اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد ہیں۔ لہذا اور حقیقت انہی کی فقہی آراء ہیں کہ جنہوں نے فقہ حنفی کی شکل اختیار کی۔

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدریؓ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مَنْكراً فَلْيَغْيِدْ بِهِ"۔ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اُس پر لازم ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے یعنی طاقت سے بدل ڈالے۔" "وَأَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ"۔ "لیکن اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے پاس تو ت طاقت نہ ہو تو اسے زبان سے روکے، اس کی مذمت کرے، اس پر تنقید کرے گویا "زبان سے اُسے بدلنے کی کوشش کرے۔" "وَأَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ"۔ "اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو" یعنی زبانوں پر بھی قدغیں لگا دی گئی ہوں، زبانوں پر بھی پہرے ہوں تو فبقلبہ"۔ "پھر اپنے دل سے" یعنی کم سے کم دل میں ایک گھٹن تو محسوس کرے، قلب میں ایک کرب، صدمہ اور رنج کی کیفیت تو ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آخری کیفیت کے بارے میں فرمایا: "وَذَلِكَ أضعف الإيمان"۔ "یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

اب میں آپ سے اس حدیث پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ دیکھیے! اس میں

پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ اس میں 'امر بالمعروف، کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔ سارا زور 'نہی عن المنکر' پر ہے۔ ایک اسلامی نظام حکومت کا فرض ہے کہ قوت و طاقت کے ساتھ منکرات کو روک دے لیکن اگر اسلامی نظام حکومت قائم نہیں ہے اور منکرات کو فروغ ہو رہا ہے تو بندہ مومن پر واجب ہے کہ وہ دیکھے کی چوٹ حق کی بات کہے، منکرات کے خلاف تنقید کرے، زبان و قلم سے ان منکرات کو بدلنے کی سعی کرے لیکن ایک شخص کمزور ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے منکرات کے خلاف آواز اٹھائی، زبان کھولی تو اول تو معاشرہ ہی میرا استہزاء کرے گا، مذاق اڑے گا پھر ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت مجھے اس پر قید کر کے جیل میں ٹھونس دے۔ لہذا وہ زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پاتا لیکن وہ ان منکرات کے خلاف دل میں جھپن اور گھٹن محسوس کرتا ہے، ان منکرات پر کڑھتا ہے تب بھی حضورؐ کے ارشاد کے بموجب اس کے دل میں ایمان ہے تو سہی لیکن کمزور ترین ایمان۔ 'اضعف، افعل' اتقفل کا صیغہ ہے یعنی ایمان کی کمزوری اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کی دوسری روایت کے آخری حصہ میں "وذلك اضعف الایمان" کے بجائے یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل" یعنی اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رانی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے۔ البتہ تینوں کیفیتیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کے لیے خارج میں آپ کوئی ضابطہ بنا سکیں بلکہ اس کا سارا معاملہ انسان کے اپنے ایمان و یقین پر ہے۔ اس کے اندر کتنا یقین (CONVICTION) ہے۔ اس کے اندر دین کے لیے کتنی غیرت و حمیت ہے! اس کا دار و مدار اس پر ہے۔ اس لیے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے اور وہ چیپ کھڑا رہے۔ اس کا یہ طرز عمل غمازی کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے اندر جرات و ہمت نہیں ہے بلکہ غیرت و حمیت کا بھی فقدان ہے۔ لیکن کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے تو اگر اس میں ہمت نہیں ہے، مگر غیرت و حمیت موجود ہے تو کم از کم یہ لازماً ہو کر رہے گا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آجائے گا۔ وہ کچھ اور نہیں کر سکے گا تو اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپنے لگے گا اور لرزے گا اور دل ہی دل میں انتہائی کرب، صدمہ اور رنج محسوس کرے گا۔ غیرت و حمیت کا کم سے کم تقاضا یہ توہر

ایک تسلیم کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جائے، وہ تھر تھراتے اور دل میں کرب و اضطراب محسوس کرے اور اگر اس میں کوئی دم بھی ہے، طاقت بھی ہے تو وہ اس شخص کو یونہی جانے نہیں دیگا جس نے اسے ال کی گالی دی ہے۔

اس مثال سے آپ اس بات کو سمجھئے کہ جن میں اللہ کے دین کی زیادہ غیرت و حمیت ہوگی وہ اپنی کمزوری کے باوجود ڈٹ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیلوں میں ٹھونس دیتے جائیں گے یا پھر یہ کہ لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔ یا آخری درجہ میں جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ اس زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں کھپا دیا جائے۔

جان دی، دی ہوتی اسی کی بھتی! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! حدیث کا آخری ٹکڑا "وَذَلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ" یہ بتا رہا ہے کہ اصل مطلوب اور غیرت و حمیت دینی کا تقاضا یہ ہے کہ بدی کے خلاف طاقت فراہم کی جائے اور اس کا اتصال کیا جائے اب دوسری حدیث کی طرف آئیے۔ یہاں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور زیادہ نکھار کر بیان کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَ اللَّهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي" — یعنی "مجھ سے پہلے اللہ نے جس اُمت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا، اَلَا كَانَ لَهُ فِي أُمَّتِهِ حَوَارِيُونَ وَأَصْحَابٌ؟" تو اس کی اُمت میں اس کے حواری اور اصحاب ہوتے تھے" — حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے آتا ہے جیسے: "قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ"۔ اونہی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے صحابہ یا اصحاب کا لفظ آتا ہے۔ حضورؐ نے یہاں "وَلَوْ اَلْفَاظُ" یعنی حواریوں اور اصحاب کو جمع کر لیا۔ وہ کیا کرتے تھے؟ "يَأْخُذُونَ بَسْتَه وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ"۔ "وہ اپنے نبی کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تھے اور نبی علیہ السلام کا جو بھی حکم جوتا تھا اس کی پیروی کرتے تھے" — "ثُمَّ انْهَاطُ خَلْفٍ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلُوفٌ" — "پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آتے تھے جو ان کے

اور ناخلف ہوتے تھے۔“ گویا ایک یا تین نسل تک تو معاملہ بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ میں نے ایک دو نسل کیوں کہا! یہ بھی حضورؐ کی ایک حدیث میں آیا ہے ”خیر اُمّتی قرنی ثم الذین یلوّنھم ثم الذین یلوّنھم“ یعنی میری اُمت کا بہترین دور میرا دور ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملیں گے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملنے والوں سے ملیں گے۔ ان ادوار کو ہم ”قرون مشہود لہا بالخیر“ کہتے ہیں گویا حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ بہترین ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر تابعین کا زمانہ ہے اور اس کے بعد درج ہے تبع تابعین کے عہد کا! — اب پھر حدیث زیر بحث کی طرف رجوع کیجئے، فرمایا: ”ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف“ ایک ایک لفظ پر غور کیجئے — حضورؐ نے فرمایا ”ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو ناخلف اور نالائق ہوتے تھے“ ”یقولون مالا یفعلون“ ”وہ کہتے تھے جو کچھ کرتے نہیں تھے۔“ ”ویفعلون مالا یؤمرون“۔“ اور کرتے وہ کام تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا۔“ یہاں اشارہ بدعات کی طرف ہے گویا دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں، نئے نئے طریقے اختراع کر لیے گئے ہیں۔ یہ اصول پیش نظر رکھیے کہ جو بدعت بھی آئے گی وہ کسی نہ کسی سُنّت کو ہٹا کر اس کی جگہ لے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بدعت آئے اور سُنّت نصحت نہ ہو۔ — ان ناخلف اور نالائق جانشینوں کے متعلق حضورؐ نے بڑا خوبصورت اور جامع پیرائہ بیان اختیار فرمایا۔ ”یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون“ — آگے بڑھنے سے قبل پہلے تو بغور کیجئے کہ ہم کس دور میں ہیں! آیا ہم اُس دور میں بس رہے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا یا اُس میں جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اب تو پندرہویں صدی ہجری شروع ہو چکی ہے۔ جبکہ دور صحابہؓ کے بعد چوتھی ہی نسل سے بالکل ابتدائی درجے میں وہ بات شروع ہو چکی تھی — جس کے متعلق مشہور تبع تابعی، محدث اور اپنے دور کے عالم باعمل اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے اس شعر میں رہنمائی کی ہے: ہ

وما افسد الدین الا الملوك واحبار سوء ورهبانہما

یعنی دین میں جو خرابی بھی آتی ہے وہ تین اطراف سے آتی ہے — بادشاہوں کی طرف سے۔

علمائے سنی یعنی بُرے علماء کی طرف سے اور بُرے صوفیوں کی طرف سے ایک تو علماءِ حقانی ہیں جو واقعی اللہ کے دین کو عام کرتے ہیں۔ اس پر خود بھی چلتے ہیں اور لوگوں کو بھی چلاتے ہیں۔ ایک وہ اللہ والے صوفیاء ہیں جو اللہ ہی کے راستے پر چلنے اور چلانے والے ہیں لیکن اس بازار میں تو ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ جہاں علماءِ حقانی ہیں وہاں علماءِ سنی بھی ہیں۔ جہاں دین و شریعت پر عامل صوفیاء ہیں وہاں دنیا دار اور ظاہر دار صوفی بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تشخیص کے مطابق دین میں خرابی ان تین اطراف سے آتی ہے اور انہوں نے ان خرابیوں کا بنفس نفیس کسی قدر مشاہدہ کیا جو گاہ جب ہی تو تشخیص کی تھی۔ تو اندازہ کیجئے کہ ہم تو پندرہویں صدی میں بیٹھے ہیں تو خرابیوں کے اعتبار سے ہم کس مقام پر ہیں! — آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”فمن جاہد ہم بیدہ فهو مؤمن“ جو کوئی ایسے ناخلف لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے پس وہ مؤمن ہے۔ ”ومن جاہد ہم بلسانہ فهو مؤمن“ اور جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے پس وہ مؤمن ہے۔ ”ومن جاہد ہم بقلبہ فهو مؤمن“ اور جو ایسے نالائقوں کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا یعنی ان کے افعال پر اپنے دل میں کرب اور صدمہ محسوس کرے گا اور مضطرب اور بے چین رہے گا پس وہ بھی مؤمن ہے۔ — اور آخر میں حضورؐ نے فرمایا: ”ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل“ اور اس کے بعد تو ایمان رانی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کے آخری حصے پر غور کیجئے! یہ لڑزہ طاری کر دینے والی وعید ہے۔ اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے تو الصادق والمصدق، شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہاں حقیقی ایمان کی نفی مراد ہے قانونی طور پر نفی نہیں ہے اور یہ دل کا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دل اور نیت کے معاملات کے متعلق اس دنیا میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ فیصلہ تو آخری عدالت میں ہوگا، جس کے متعلق سورۃ التغابن میں فرمایا: ”ذلک یوم التغابن“ یعنی ”آخرت کا دن ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن“ —

اس حدیث شریف کے ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ کیجئے! — اس حدیث میں ”ہم“ کی ضمیر مفعولی انتہائی قابل غور ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ناخلف جانثیوں کے خلاف

جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں، جن کے طور طریقے منکرات پر مشتمل ہوں، جو ذرائعِ ابلاغ کو منکرات کی تہنیر و اشاعت کے لیے استعمال کر رہے ہوں، جو ملک بھر میں ایسے تمام اداروں کی داغ بیل دے، سنی سرپرستی کر رہے ہوں، جو منکرات کے فروغ میں دن رات مصروف ہوں۔ جن کی مساعی کی بدولت معروفات معاشرہ میں سکسک رہی ہوں اور وہ سنڈاس بن گیا ہو۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ان علماء سوء کے اور ان نام نہاد صوفیاء کے خلاف بھی جہاد کی تاکید اس حدیث میں تبعاً موجود ہے جو مسندِ اقتدار و ارشاد پر بیٹھے ان منکرات کو دیکھ رہے ہوں اور نہ صرف مہربلب بلکہ اقتدار و وقت کے اعوان و انصا بنے ہوئے ہیں۔

اُمت کی وحدت اور نصبِ العین

سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۱ میں اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سند عطا فرمائی گئی ہے کہ ”تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر نچستہ ایمان رکھتے ہو!۔۔۔ گویا پوری اُمت مسلمہ کا مقصد وجود ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور اصلاً مطلوب یہ ہے کہ پوری اُمت ایک جسدِ واحد کے مانند ہو اور اس کا اجتماعی نصبِ العین ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن جائے، پھر یہ بھی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جہاں اجتماعیت میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یکسانیت سے نصبِ العین کی جانب پیش قدمی میں مزید شدت و قوت پیدا ہوتی ہے، وہاں نصبِ العین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قلبی و جذباتی وابستگی بچائے خود اجتماعیت کو مزید تقویت و استحکام بخشنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس طرح قدم آگے سے آگے بڑھتے چلتے جاتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ مطلوبہ اور مثالی معیاری کیفیت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی۔ جیسا کہ خود اُمتِ مسلمہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین یا چار نسلوں تک تو یہ کیفیت برقرار رہی لیکن اس کے بعد نصبِ العین سے وابستگی میں ضعف پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اس کے نتیجے میں اُمت کی وحدت اور یکسانیت میں بھی دراڑیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ تا آنکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُمتِ واحدہ

کا تصور تو صرف ذہنوں میں باقی رہ گیا ہے۔ بالفعل اس وقت دنیا میں ایک امت مسلمہ کی بجائے بے شمار مسلمان اقوام اور قومیں موجود ہیں۔

قرآن حکیم چونکہ ایک ابدی ہدایت نامہ ہے، لہذا اس نے ایسی صورت حال کے لیے بھی پیشگی ہدایت عطا فرمادی تھی جو اسی سورۃ مبارکہ کی آیت نمبر ۴۰ میں وارد ہوئی ہے، جس پر تفصیلی گفتگو صفحہ گزشتہ میں ہو چکی ہے اور جس کا خلاصہ اور لُپ لباب یہ ہے کہ اس منتشر اور خوابیدہ امت میں سے جو لوگ جاگ جائیں اور انہیں اپنے اجتماعی فرائض کا شعور و ادراک حاصل ہو جائے وہ باہم جمع ہوں اور مل جل کر اُس خیالی و تصوراتی اور خوابیدہ و معطل امت کے دائرے کے اندر اندر ایک چھوٹی مگر فعال اور منظم امت وجود میں لائیں جو اس اجتماعی نصب العین کی جانب پیش قدمی شروع کر دے۔ پھر جیسے جیسے نشانِ منزل نمایاں ہوتا جائے گا زیادہ سے زیادہ لوگ اس قافلہ میں شامل ہوتے چلے جائیں گے اور وہ صورت عملاً پیدا ہو جائے گی کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

تا آنکہ پوری امت مسلمہ کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آجائے گا اور وہ نقشہ بالفعل نگاہوں کے سامنے آجائے گا جس کا خواب نصف صدی پیشتر بحکیم الامت علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے دیکھا تھا، یعنی:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آمینہ پوش	اور ظلمتِ رات کی سیاب پا ہو جائے گی
آئیں گے سینہ چاکاںِ چمن سے سینہ چاک	بزمِ گل کی ہم نفس با و صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود	پھر جہیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معور ہو گا نغمہ توحید سے

اب اصلاً تو ہمیں آگے بڑھ کر اس امر پر غور کرنا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نبوی طریق کار کیا ہے، اور اس کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکمت عملی اختیار فرمائی تھی۔ اس لیے کہ حضرت البخاری رضی اللہ عنہ کے ایک حکیمانہ قول کے مطابق جسے امام مالک رحمہ اللہ نے زندہ جاوید

بنادیا اس اُمت کے آخری حصّے کی اصلاح اور تعمیر نو صرف اسی طریق پر ممکن ہے جس پر اس کے پہلے حصّے کی اصلاح ہوئی تھی۔ لیکن اس سے قبل ————— اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کی اہمیت اور اس کے اجتماعی نصب العین کی وضاحت کے ضمن میں امیرِ تبلیغ مولانا محمد یوسفؒ کی زندگی کی آخری تقریر سے نہایت اہم اور ایمان افروز اقتباس پیش کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کی اہمیت مزید کچھ کر سامنے آجائے اور خاص طور پر یہ امر لوہی طرح مبرہن ہو جائے کہ مسلمانوں کے اُمت ہونے کی اہمیت کیا ہے جس کے لیے مولانا موصوفؒ نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے محاورے کے مطابق ’اُمت پنا‘ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

واضح رہے کہ مولانا محمد یوسفؒ سلسلہ تبلیغ کے بانی اور مونس مولانا محمد الیاسؒ کے فرزند ارجمند اور ہر اعتبار سے خلف الرشید تھے اور انہوں نے اپنے والد بزرگوارؒ کے انتقال کے بعد جس طرح ان کے جاری کردہ مشن ہی کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی قوتوں اور توانائیوں کی آخری رقیق تک وقف کر دی تھی، وہ بہت سے دین کے خادموں اور اُن کی اولاد کے لیے قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف تین دن قبل یعنی ۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو بعد نماز فجر رائے ونڈ کے مرکز تبلیغ میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فرمودات شیخ طریقت حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

”دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اس کے

باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے چمکائے گا اور نہ

اپنے پاؤں پر کلبھڑی مارے گا۔

یہ اُمت بڑی مشقت سے بنی ہے۔ اس کو اُمت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوصحابِ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں اور اُن کے دشمن یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا اُمت پنا (یعنی اُمت ہونے کی صفت) کھوپچے ہیں۔ جب تک یہ اُمت بنے ہوئے تھے، چنانچہ لاکھ لاکھ ساری دنیا پر جاری تھے۔ ایک پکا مکان نہیں تھا، مسجد تک پہنچی نہیں تھی۔ مسجدیں چراغ

تک نہیں جلتا تھا، مسجد نبویؐ میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تیس داریؑ ہیں، وہ ۹۷ھ میں اسلام لائے ہیں اور ۹۷ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک امت بن چکے تھے۔ تو جب یہ سب کچھ ہو گیا اس وقت مسجد نبویؐ میں چراغ جلا، لیکن حضورؐ جو نور ہدایت لے کر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور امت بن چکی تھی۔ پھر یہ امت دنیا میں اُبھی۔ جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گسے۔ یہ امت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا۔ مال و جائیداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ اور رسولؐ کیا فرماتے ہیں۔ امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں سارے رشتے اور تعلقات کٹ جاتیں۔ جب مسلمان ایک امت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری امت ہل جاتی تھی۔ اب ہزاروں لاکھوں گھلے گھلے ہیں اور کانوں پر جوں تک نہیں رہتی۔

امت کسی ایک قوم اور ایک علاقے کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر امت بنتی ہے۔ جو کسی ایک قوم اور ایک علاقے کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ امت کو ذبح کرتا ہے۔ اور اُس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے۔ امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے تو ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا ہے۔ اگر مسلمان اب پھر امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں بھی مل کر اُن کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایم بی ایم اور آر کٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی تھیں تو کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پھٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے امت اپنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں۔ ساری جاہلی

اس وجہ سے ہے کہ اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح اُمت بنائی تھی؟

اُمت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا غامزی اور ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اُس نے کہا سب کچھ کر لو، لیکن میری زبان مٹ کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا کہ علیؑ کا قاتل میری اُمت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہو گا۔ اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی۔ حالانکہ انہوں نے ہی اکبر کو گمراہ کر کے دین کو برا دکھایا تھا۔ توجو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل اور فیضی میں تھیں وہ اُمت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہیں؟

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی و دینداری کے لحاظ سے بہترین مجرب تھے۔ وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اُگتی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ، ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ انہوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کر دیئے گئے۔ اور اس طرح خود مسلمانوں نے، علاقائی بنیاد پر اُمت پنہ کو توڑ دیا۔ اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو، میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب اُمت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارے میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دُوب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجے میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہو جاتی) اس کا نتیجہ حضرت سعدؓ کو دنیا ہی میں جھگڑنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنتاں نے قتل کر دیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخنزرج سعد بن عبادہ

رمیناہ بسہم فلم یخط فوادہ

(ہم نے قبیلہ خنزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا) اس واقعہ نے ثابت کر دیا اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقے کی بنیاد پر امت پنے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دے گا۔ امت جب بنے گی جب امت کے سب طبقے بلا تفریق اس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں اور یاد رکھو امت پنے کو توڑنے والی چیزیں معاشرت اور معاملات کی خرابیاں ہیں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ نا انصافی اور ظلم کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف دیتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور امت پنا ٹوٹتا ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے۔ ان کی تقسیم کا مشورہ ہوا اس وقت امت بنی ہوئی تھی۔ یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلے یا ایک ہی طبقے کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے مشورے سے باہم ملے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلے والوں کو دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے قبیلے والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلے والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آئے۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقہ میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضورؐ کے تعلق کو ہی معیار بنایا جائے۔ جو نسب میں آپ کے زیادہ قریب ہوں ان کو زیادہ دیا جائے۔

جو دوم، سوم، چہارم نمبر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے۔ اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے، اس کے بعد بنی عبد مناف کو، پھر قحطی کی اولاد کو، پھر کلاب کو، پھر کعب کو، پھر مرثہ کی اولاد کو۔ اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلے کو اتنے پیچھے ڈال دیا۔ اس طرح بنی بھی یہ اُمت۔

اُمت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو، پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ، سب کچھ کیا ہوگا، مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس کی کسی بات نے اُمت میں تفریق ڈالی ہوگی۔ اُس سے کہا جائے گا کہ پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا اُٹھگت لے، جس کی وجہ سے اُمت کو نقصان پہنچا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز، روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا۔ مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا۔ وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے۔ اس کو بتایا جائے گا کہ تو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے اُمت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رُک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اُسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمت کے بنانے اور بگاڑنے، توڑنے اور جوڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے۔ یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور بھاڑتی بھی ہے۔ زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لائحہ عمل چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور چھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبان پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آرہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی

توفیق ملی تو حضورؐ کی، اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہو گئیں اور اوس نے خنزرج، شیر و شکر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اُسکیم بنائی کہ کس طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پُرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے حضورؐ سے کسی نے جا کر کہا۔ آپؐ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوتے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے۔

آپؐ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا۔ دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے درغلا یا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے

دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرماں بڑا بندے بنے رہو۔ جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا، اُس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اُس کی تابعداری

کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا اور اُمت پھوٹنے سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ فُلُوكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا —

اور اللہ کی رسی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمت پنپنے کی صفت کے ساتھ سب

مل جل کر دین کی رسی کو تھامے رہو اور اُس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقے کی بنیاد پر یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ اور اللہ کے اُس احسان کو نہ بھولو کہ اُس نے

تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آ رہی تھی تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنادیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے

کنارے پر کھڑے تھے، پس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تمام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

شیطان تمہارے ساتھ ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور ہر فساد سے روکنا ہو۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَالِحُونَ

امت میں ایک گروہ وہ ہو، جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور قریم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے۔ نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے۔ برائیوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے امت ایک امت بنی رہے۔

(ماخوذ از ”دو خطرہوں کا علاج“ فرمودہ شیخ ابوبلیغ حضرت مولانا محمد یوسفؒ، شائع کردہ: افتخار احمد

فریدی، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔ انڈیا)

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اس تقریر کا ایک ایک لفظ دل سے نکلا ہے اور اس میں کسی تکلف اور تصنع یا آدر و کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج ملت اسلامیہ پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت اسی سبق کی نہیں ہے جو ان فرمودات میں سامنے آتا ہے؛ دکاش کہ ملت کے درمندا اصحاب ثروت اس تقریر کو نہ صرف اُردو بلکہ پاکستان کی جملہ علاقائی زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں طبع کر کے تقسیم کرائیں۔

ہنی عن المنہ سر کا نبوی طریق کار

اب ذرا اپنی توجہ کو دوبارہ مرکوز فرمایجئے صحیح مسلمؒ کی ان دو روایات کی جانب جن میں ہنی عن المنہ یعنی منکرات اور سیئات کے سد باب کا تاکید می حکم بھی وارد ہوا ہے اور اس کے تین مراتب و مدارج کا بھی ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

(۱) ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی کسی بُرائی کو دیکھے اُس کا فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) روک دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ پاتا ہو تو (کم از کم) دل سے (نفرت کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے!“

(۲) ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے کوئی ایسا نبی نہیں گزرا جسے اللہ نے کسی اُمت میں مبعوث فرمایا ہو اور اس میں اس کے صحابی اور حواری پیدا نہ فرماتے ہوں جو اس کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر (ہمیشہ ایسا ہوا کہ) اُن کے بعد ایسے منافق لوگ پیدا ہو جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہ تھے اور کرتے وہ تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوتا تھا۔ تو جس کسی نے ایسے لوگوں کے ساتھ ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ اور اس کے بعد تو ایمان ایک رانی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں ہے!“

اب یہ امر تو ایسا ظاہر و باہر ہے کہ جس کے بارے میں کسی صاحبِ ایمان کو ذرہ برابر شک شبہ نہیں ہو سکتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان تینوں درجوں میں سے بلند ترین ہی کو اختیار فرمایا اور طاقت ہی کے ذریعے منکرات اور سیئات کا فوری استیصال بھی کیا اور آئندہ کے لیے سببِ باب بھی فرمایا، لیکن سوال یہ ہے کہ آنحضورؐ نے طاقت کا یہ استعمال کس طریق پر کیا ہے؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضورؐ نے طاقت کا استعمال اس طرح نہیں کیا کہ جب آپؐ نے دعوت شروع کی تو میں کچیں سعید و حیں آپؐ پر ایمان لے آئی تھیں، ان کا ایک چھوٹا سا جتھہ بناتے اور انہیں حکم دیتے کہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر جاؤ اور کعبہ شریف میں رکھے ہوئے سارے صُبت توڑ دو۔ ذرا غور فرمائیے کہ حضورؐ ایسا کر سکتے تھے یا نہیں؟ — یقیناً کر سکتے تھے اور عملاً یہ بالکل ممکن تھا اس لیے کہ وہاں کعبہ کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی مسلح پہرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جا کر صحابہ کرامؓ تمام بتوں کو توڑ سکتے تھے۔ یہ مکہ میں سب سے بڑا منکر

تھا کہ نہیں، لیکن حضورؐ نے اسے برواشت کیا۔ کیوں کیا؟ اس لیے کہ صحیح طریق کاری یہ ہے کہ پہلے ایک معتدبہ افراد کی ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ فدا تین اور تربیت یافتہ جاں نثاروں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے۔ گویا ایک طاقت فراہم کی جائے۔ یہاں تربیت سے مراد عسکری تربیت نہ لے لیجئے گا۔ اس سے مراد ہے روحانی و اخلاقی تربیت جس کے لیے ہمارے دین کی اصطلاح ہے تزکیہ۔ ایک کام کرنے کے بعد اسے برقرار رکھنا اصل کام ہے۔ ایک مرتبہ کعبہ کے تمام بتوں کو توڑ دینا اصل کام نہیں ہے۔ توڑنے کے بعد توحید کا نظام برقرار رہے اور یہ کام سرانجام دینے والی طاقت قائم رہے۔ جب ہم شکل پیدا نہیں ہو گئی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ توحید کی بذریعہ قرآن زبانی دعوت و تبلیغ فرمائی۔ جو لوگ ایمان لائے انہیں منظم کیا۔ ان کی تربیت کی، ان کا تزکیہ فرمایا۔ ان میں قربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کیا۔ ان میں دین کے یلتمن من وھن لگا دینے کا ایک عزم و مصمم پیدا کیا۔ پھر ان کے اندر ایک ڈسپلن پیدا کیا کہ جو حکم دیا جائے مانیں۔ چنانچہ قریباً بارہ برس تک مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ مسلمانو! تمہارے ٹکڑے بھی کر دینے جائیں تب بھی تمہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت خباب ابن ارت کو دیکھتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے لیکن مسلمانوں کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ کیا مسلمان بے غیرت تھے! معاذ اللہ۔ خاص طور پر جب میں یہ سوچتا ہوں تو مجھ پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے کہ حضرت سمنیہؓ کو ابوہل نے شہید کیا ہے اور کس طرح شہید کیا ہے! کس قدر کمینگی کے ساتھ انہیں ایذا میں پہنچاتی ہیں۔ ماں کو جوان بیٹے کے سامنے نہ لگا کیا ہے۔ پھر مزید جو کچھ کیا ہے میرے قلم پر نہیں آسکتا۔ اور بالآخر جب شہید کیا ہے تو ناک کر اُن کی شرم گاہ میں اس طرح برچھا مارا ہے کہ پشت سے آر پار ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ مجمع عام میں ہو رہا ہے اور اس وقت تک کم سے کم تیس چالیس مسلمان موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک ہزاروں بلکہ لاکھوں کے برابر تھا۔ سوچتے کہ کیا تیس چالیس مسلمان معاذ اللہ بے غیرت تھے! ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ ہماری ایک بہن جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلہا پڑھنے والی ہے، اس کے ساتھ ابوہل یہ پہچانہ سلوک کر رہا ہے۔ اگر انہیں اجازت ہوتی تو کیا وہ ابوہل کی تکالوٹی نہ کر دیتے! لیکن اجازت نہیں تھی کبھی سیرت مطہرہ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ آل یا سر جو تین افراد پر مشتمل گھرانہ تھا، حضرت یاسرؓ ان کی اہلیہ حضرت سمنیہؓ اور ان کے بیٹے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

ان پر ابھلنے جو سلسلہ تم دھاڑا کرتا تھا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سامنے سے گزرتے تھے تو انہیں یقین فرماتے تھے: اَصْبِرُوا يَا آلَ يَاسِرٍ فَإِنَّ مَوْعِدَكُمْ الْجَنَّةَ یعنی ”اے یاسر کے گھرانے والو! صبر کرو اس لیے کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے“ — حضورؐ نے قریباً بارہ برس تک یہ تربیت دی ہے۔ سوچیے کہ یہ تربیت کس بات کی تھی۔ اس بات کی کہ ایک طرف اپنے موقف پر ڈٹے رہو، قدم پیچھے نہ ہٹے۔ لیکن دوسری طرف تمہارا ہاتھ نہ اُٹھے، بلکہ جھیلو اور برداشت کرو۔ اگر جان چلی جائے تو فہرہ مطلوب شہید ہو گئے تو فَإِنَّ مَوْعِدَكُمْ الْجَنَّةَ ادھر تمہاری آنکھ بند ہوتی ادھر جنت میں داخلہ ہو گیا۔ سورہہ یسؑ تو آپؐ پڑھتے ہوں گے، وہاں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب رسولوں کی تصدیق کرنے والے شخص نے یہ کہا تھا: اِنِّيْ اَمْنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ یعنی ”میں لو کہ میں تو ایمان لاتا ہوں اس پر جو تم سب کا رب ہے“ تو فوراً انہیں شہید کر دیا گیا۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف جو نتیجہ نکلا اسے بیان کر دیا:

”قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَلِيَّتْ قَوْمِيْ يَٰعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا عَصَيْتُ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمَكْرُمِيْنَ ۝“ یعنی جیسے ہی شہید ہوئے جنت میں داخلہ کا پروانہ مل گیا اور انہوں نے کہا کہ کاش میری قوم کو میرے اس اعزاز کا علم ہوتا۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں نے کتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مجھے میرے رب نے حساب کتاب کے بغیر بخش دیا۔ میرے تمام گناہ معاف کر دیئے اور مجھے اعزاز و اکرام پانے والوں میں شامل فرمایا۔ تو جن لوگوں کو بھی شہادت نصیب ہو جائے لاریب وہ اپنے مطلوب کو پا گئے۔

پس منکرات کا استیصال جو طاقت کے ساتھ ہے، قوت کے ساتھ ہے، گویا ”بیکدم“ ہے، اس کا ایک PROCESS ہے، ایک طریقہ ہے۔ وہ طریقہ ہمیں سیرت النبیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے لینا ہو گا۔ وہ وقت بھی آیا کہ حضورؐ نے طاقت کو استعمال فرمایا اور آپؐ کے ہاتھ میں تلوار آئی۔ غزوہ بدر میں سپہ سالار کون تھے! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! احد میں سپہ سالار کون تھا! میدان احد میں مورچہ بندی کون کر رہا تھا! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! لیکن طاقت کے استعمال کے مرحلے سے پہلے جو مراحل ہیں، انہیں ملحوظ رکھنا اور انہیں طے کرنا ضروری ہے۔ وہ مراحل ہیں کہ قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے پہلے ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ اس

میں وہ افراد شریک ہوں جو شعوری طور پر تقویٰ، اطاعت اور فرماں برداری کی روش اختیار کریں۔ تکمیل کی بات نہیں ہے۔ تکمیل تو موت تک نہیں ہوگی۔ لیکن یہ تو ہو کہ فیصلہ کر کے ایک عزم مصمم کے ساتھ تقویٰ اور اسلام کی راہ پر چل پڑے ہوں: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** ۵۔ پھر وہ باہم جڑیں، باہم مربوط ہوں: **وَاغْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ پھر ان کی آپس کی محبت مثالی محبت ہو۔ **وَهُوَ رَحِيمٌ بَيْنَهُمْ** اور **أَذَلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ** کا کامل پیکر ہوں اور ان کا حال یہ ہو: **وَيُؤْتِيهِمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ**۔ اور وہ اپنی جانوں سے اپنے مسلمان بھائیوں کی ضروریات کو مقدم رکھتے ہیں چاہے اپنے اوپر فائدے گزر رہے ہوں۔ ان کی محبتیں ایسی ہوں کہ ایک زخمی کراہ رہا ہے۔ جان نکلنے کے قریب ہے اور پکار رہا ہے العطش، العطش۔ پانی کا پیالہ ان کے پاس لایا جاتا ہے کہ دوسرے بھائی کی آواز آجاتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پلاؤ۔۔۔ پیالہ وہاں پہنچتا ہے کہ تیسرے زخمی کی آواز آتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پہنچاؤ۔ پیالہ تیسرے کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ پیالہ دوسرے کے پاس واپس آتا ہے تو ان کا دم بھی ٹھیک چکا ہوتا ہے۔ اب پیالہ پہلے زخمی کے پاس لایا جاتا ہے تو ان کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی۔ ایک طرف یہ ایثار اور رُحماءِ بیںہ کے یہ شان اور دوسری طرف یہ رویہ اور کیفیت کہ: **فَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا**۔ سنو اور اطاعت کرو۔ (LISTEN AND OBEY) اگر یہ ڈسپلن نہیں تو یہ جماعت نہیں MOB ہے۔ یہ حزب اللہ نہیں ہے، ایک ہجوم ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال نے اسی فرق کو واضح کیا ہے۔ عیدِ آزادوں شکوہ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ منوں! یہ ہجوم ہوتا ہے چاہے دو لاکھ کا مجمع ہو۔ کوئی نظم نہیں، کوئی ڈسپلن نہیں، کوئی کسی کا حکم سننے والا اور ماننے والا نہیں۔ شخص اپنی جگہ گویا سقراط و بقرط ہے۔ کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے والا نہیں ہے۔ اس ہجوم سے کوئی مثبت اور نتیجہ خیز کام نہیں ہوتا۔ یہ کام اگر ہو گا تو صرف ایک منظم جماعت

کے ذریعہ سے ہو گا۔

اسی بات کو نہایت تاکیدی اسلوب سے اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ — تم میں سے لازماً ایک گروہ، ایک جماعت، ایک (چھوٹی) امت ایسی ہونی چاہیے جس میں شامل لوگ خیر کی طرف دعوت دینے، پکارنے اور بلائے والے ہوں نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہوں — امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبان سے تو ہر وقت ہو سکتا ہے، صرف انسان کے اندر جرات کی ضرورت ہے۔ جس بات کو سنی اور صحیح سمجھے اسے بیان کرے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا کہ: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ منکرات کے خلاف سلطان جائز کے سامنے کلمہ حق کہنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں افضل الجہاد کہا ہے اور اس دور میں اصل سلطان عوام الناس ہیں جن کے ووٹوں سے اقتدار کسی پارٹی کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال یہ ”سلطانی جمہور“ کا زمانہ ہے۔ اس لیے جہاں نہی عن المنکر کا ایک رُخ ارباب اقتدار کی طرف ہونا چاہیے وہاں اس سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ اس کا رُخ معاشرہ کی طرف ہونا چاہیے۔ اگر نہی عن المنکر سے پہلو تہی ہوگی، اعراض ہو گا تو اس کا دود کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا کہ یا زدی ہے یا بے محبتی ہے باقی اور کوئی مشکل نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ بات بھی جان لیجئے کہ امر بالمعروف بہت آسان کام ہے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا، نصیحت کرنا، اعمال صالحہ کے فضائل بیان کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر چہ ان کی بھی اہمیت ہے اور کون ہے جو اس سے انکار کرے گا، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ لوگ صرف انفرادی طور پر نیکو کار بن جائیں گے۔ معاشرہ ہرگز تبدیل نہیں ہو گا جب تک منکرات کے خلاف جماعتی سطح پر منظم محنت، سعی و کوشش، جدوجہد بلکہ خالص دینی اصطلاح میں جہاد نہ ہو، اور یہ واقعی مشکل اور جان جو کھوں کا کام ہے۔

لہذا اس جہاد کے لیے جس کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد بالیہ یعنی طاقت کے ساتھ جہاد قرار دیا ہے: فَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ پہلے ایک جماعت تشکیل دی جائے جس میں شامل لوگوں میں ایک

طرف تقویٰ اور فرائی بر داری کے اوصاف ہوں، دوسری طرف اعتصام و تشک بالقرآن کا عمل ہو، اور تیسری طرف اس جماعت کے لوگ باہم نہایت محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والے ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ سمع و طاعت کے نظم کے ساتھ ایک امیر کی اطاعت فی المعروف کو اپنے اوپر لازم اور واجب بلکہ فرض سمجھنے والے ہوں۔ اس کام کے لیے جو جماعت درکار ہے اس کے اوصاف کی رہنمائی ہمیں اس حدیث سے ملتی ہے جو حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی ہے اور جسے امام احمد ابن حنبل اور امام ترمذی رحمہما اللہ بالترتیب اپنی ’مسند‘ اور اپنی ’جامع‘ میں لائے ہیں۔ حضرت حارث الاشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أَمْرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهَجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ**۔ ”میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزام جماعت کا، سمع و طاعت کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت و جہاد کا۔“ ایک دوسری روایت میں ’أَمْرُكُمْ بِخَمْسٍ‘ کے بعد الفاظ آئے ہیں: **اللَّهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ** ”یعنی“ اس کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے۔“ یعنی میں تم کو یہ حکم اللہ کے حکم کی تعمیل میں دے رہا ہوں۔ اس حدیث میں ’ہجرت و جہاد‘ کی جو اصطلاحات آئی ہیں ان کے وسیع تر معانی و مفاہیم پر بعد میں گفتگو ہوگی۔

موجودہ دور میں ’نبی عن المنکر بالید‘ کی عملی صورت

اب توجہ فرمائیے اس مسئلے کی جانب کہ اگر مطلوبہ اوصاف والی جماعت وجود میں آجاتے اور نبی عن المنکر باللسان یعنی زبان و قلم کے ذریعے منکرات کے خلاف جہاد کا حق ادا کیا جا چکا ہو تو اس کے بعد ہاتھ یا قوت سے نبی عن المنکر کے لیے کس طرح اقدام کیا جائے گا۔ یہ اس کے جواب کے لیے پہلے مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرنا ہے۔ — آج سے چند سال پہلے ۲۳ مارچ کا دن آنے والا تھا، جسے ’یوم پاکستان‘ کے نام سے ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ میں ۲۳ مارچ سے چند دن پہلے عمرہ کے لیے جانے والا تھا کہ مجھے لاہور کے ایک گریز کا کالج کی پرنسپل صاحبہ کا فون آیا کہ ”آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کو مٹرکوں پر جوان لڑکیوں کی پریڈ ہوتی ہے اور اس کو دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے

ٹھٹ لگے ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیاں سینہ تان کر پریڈ کرتی ہیں۔ اس پر آپ نے کبھی کوئی نکتہ نہیں کی۔ میں واقعی حیران ہوا کہ کیوں میری توجہ اس طرف نہیں ہوتی! میں نے اپنے آپ کو پہلے یہ "الائنس" دیا کہ میں نے آج تک کوئی پریڈ نہیں دیکھی۔ نہ میرے ہاں ٹی وی ہے کہ اس پر دیکھنے کا کسی طور موقع ملتا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اخبارات میں فوٹو تو چھپتے ہیں۔ وہ تو نظر سے گزرے ہیں۔ پھر مجھے افسوس ہوا کہ اتنے بڑے منکر کی طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔ میں دل ہی دل میں ناوم ہوا۔ عمرہ کے لیے روانگی سے قبل حسب معمول مجھے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں جمعہ کی تقریر کرنی تھی۔ باغ جناح کے قریب ہی جی۔ او۔ آر (G.O.R) ہے۔ لہذا بہت سے اعلیٰ گورنمنٹ آفیسرز وہاں آتے ہیں۔ کنٹونمنٹ بھی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ لہذا بہت سے اعلیٰ ملٹری آفیسرز بھی ہاں ہوتے ہیں۔ تو میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ خدا کے لیے جس کی بھی جناب صدر تک پہنچ اور رسائی ہے وہ یہ بات ان تک پہنچانے کی یہ بہت بڑا منکر ہے۔ لڑکیوں کی پریڈ کرائی ہے تو قذافی اسٹیڈیم میں کرائیں۔ وہاں پریڈ دیکھنے صرف ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ بچیوں کو ملٹری ڈرٹینگ دیجئے، رائفل ڈرٹینگ دیجئے۔ جیسے گراؤ کالجوں کے گروگر اور دھار دیواری ہوتی ہے اور عمارتیں باپردہ ہوتی ہیں تو ایسی چہار دیواری والے میدانوں میں بچیوں کو ڈرٹینگ دیجئے اور قذافی اسٹیڈیم میں ان کی پریڈ کرائیے جس میں مردوں کا داخلہ بالکل ممنوع ہو لیکن ہماری جوان بچیاں پریڈ میں سینہ تان کر چلتی ہیں، وہ جھک کر تو نہیں چلتیں، نہ وہ ادھیر عمر یا بوڑھی ہوتی ہیں۔ یہ بہت بڑا منکر ہے۔ میں اس تقریر کے بعد عمرے کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو ۲۴ مارچ تھی۔ ۲۴ مارچ کو صبح کے روزنامے شائع نہیں ہوتے۔ مجھے ہوائی جہاز میں شام کے اخبار ملے۔ اکثر اخبارات میں اس خبر کا چرچا تھا اور انگریزی روزنامے کی تو پہلی سرخی تھی:

"WOMEN'S PARADE TOOK PLACE DESPITE THE LETTER OF MIAN TUFAIL"

اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میاں طفیل محمد صاحب نے بھی صدر ضیاء الحق صاحب کو اس بارے میں کوئی خط لکھا تھا۔ لیکن میاں صاحب کے خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پریڈ ہوئی اور ان لوگوں نے بغلیں بچائیں جو ہمارے ملک میں بے ججائی، بے پردگی اور فحاشی کے علمبردار ہیں۔ اخبارات نے جسے سرخوئیوں کے ساتھ اس بات کو چھاپا۔۔۔ گویا اس طرح ان سب دین دوست افراد کا استہزاء لگایا

جو محکرات کو مٹانے اور معروفات کو فروغ دینے کے داعی اور علمبردار ہیں۔

اب یہ بات جان لیجئے کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو کہ جمالیکشن کے لیے ووٹوں کی بھیک مانگتی نہ پھر رہی ہو اس لیے کہ اس طور پر تو معاملہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعرؒ مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج! — آؤ اگر اسلام کے نام پر الیکشن میں کامیاب ہونے والا ایک شخص بھی خراب نکل آئے تو پوری جماعت پر حرف آئے گا یا نہیں؟ ایک مچھلی پورے تالاب کو گنڈا کر سکتی ہے اور ایک کالی بھیڑ پورے گلے کو مشکوک بنا سکتی ہے۔ پھر یہ کہ جب آپ ووٹ مانگتے ہیں تو لوگوں کے غلط عقائد، غلط اعمال پر تنقید اور تحیر نہیں کر سکتے۔ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم خلاف اسلام کام کر رہے ہو، تم حرام خوریاں کر رہے ہو، تم خلاف قانون کام کر رہے ہو چونکہ انہی سے تو آپ نے ووٹ لینے ہیں۔ لہذا آپ یہ باتیں نہیں کہہ سکتے۔ اب اس الیکشن کی اسلام کے حق میں آخری خرابی کی بات بھی سن لیجئے۔ جب آپ بھی الیکشن میں اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں گے اور کوئی دوسری جماعت بھی اسلام کے نام پر ووٹ مانگے گی تو دو اسلام ہو گئے یا نہیں؟ تین یا چار جماعتیں اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لے رہی ہوں تو تین یا چار اسلام ہو جائیں گے یا نہیں؟ ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت جس شدت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب اسلام کے نام پر الیکشن لڑنا ہے۔ ہر گروہ اپنے مخصوص شعار کا جن کا اسلام سے یا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو یا اگر ہو تو محض فروعی ہو، اس طرح پروپیگنڈا کرے گا گویا یہی اصل اسلام ہے۔ عوام الناس جن کی عظیم اکثریت اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہے وہ مزید انتشار و ذہنی میں مبتلا ہوں گے یا نہیں؟ اور ہمارے خواص، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پہلے ہی سے دین کے معقولات و اساسات کے بارے میں تشکیک و ریب میں مبتلا ہیں ان جماعتوں کا ساتھ دیں گے یا نہیں جو سیکولر (لا دینی) ذہن کی حامل اور علمبردار ہیں رنجہ کے الیکشن میں جس سے زیادہ FAIR الیکشن پاکستان میں تاحال کبھی نہیں ہوا یہ نتیجہ سامنے آچکا ہے یا نہیں؟ لہذا اس بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ الیکشن کے راستے سے یہاں اسلام نہیں آئے گا۔ جو حضرات نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اسلام آ سکتا ہے اگر ان کی نیتوں میں واقعی خلوص و اخلاص ہے تو وہ لگے رہیں۔ خلوص و حسن نیت کا وہ اللہ تعالیٰ کے

یہاں اجبر ضرور پائیں گے۔ بشرطیکہ اخلاصِ نیت کے ساتھ وہ ان غلط کاموں سے اپنا دامن بچائیں جو ایکشن کا خاصہ بن گئی ہیں، جیسے جعلی ڈونگ، ووٹوں کی خریداری، علاقائی، لسانی اور برادری کی عصیتوں کو ابھارنا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی صورت میں ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہے کہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ قوتوں کا، صلاحیتوں کا، سرمایہ کا محض ضیاع ہوگا۔ اسلام اس راستہ سے آہی نہیں سکتا۔ اس ایکشن بازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جماعتوں کے تحزب اور مخالف سے ملی اتحاد میں ایسے رخنے پیدا ہوتے ہیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود ان کا بھڑانگ نہیں رہتا۔ یہ تحزب و مخالف بسا اوقات دائمی نفرت اور عداوت کا رُخ اختیار کر لیتا ہے جن کی تباہ کاریوں سے کون ہے جو ناواقف ہوگا۔

پاکستان میں اسلام آئے گا تو اس طور پر کہ اگر کوئی ایسی جماعت ہے اور معتد بہ افراد پر مشتمل ہے کہ انفرادی طور پر اس کا ہر رکن تقویٰ اور اسلام کی روش پر کاربند ہونے کے لیے دل و جان سے کوشاں ہے۔ جل اللہ یعنی قرآن مجید سے اس کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہو چلا جائے ہے۔ ہر نوع کے فقہی اختلافات سے اس کا دامن محفوظ ہے۔ وہ ائمہ اربعہ اور محدثین علیہم الرحمۃ کے فقہی اختلافات کو صرف تعبیر کا، استنباط کا اور رائج و مرجوح اور فضل و مفضول کا فرق سمجھتا ہے۔ وہ جماعت اقتدار و وقت کو چیلنج کرے گی کہ منکرات کا کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے یہ ہماری لاشوں ہی پر ہوگا۔ منکرات وہ سامنے رکھے جائیں گے جن کے منکر ہونے پر کسی فقہی محبت فکر کو اختلاف نہ ہو۔ سب اس کو منکر تسلیم کرتے ہوں۔ جیسے بے حیائی اور بے پردگی اور سودی نظام معیشت۔۔۔ یہ ہے اصل طریق کار۔ یہ ہے ایک مسلمان ملک میں ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ فَعَلِیْغَیْرَہٗ“ کے فرمان نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر تعمیل کی کوشش کیا آج لوگ اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے یہ سب کچھ نہیں کرتے یہ ایچی ٹیشن کیوں ہوتا ہے! یہ مظاہرے کیوں ہوتے ہیں! صرف سیاسی حقوق کے لیے یا صرف کسی دنیاوی سہولت کے لیے۔ لیبر یونینیں اپنی اجرت بڑھوانے اور دوسری مراعات حاصل کرنے کے لیے مظاہرے کرتی ہیں یا نہیں۔ یہ بھی ایچی ٹیشن اگر صرف دین کے لیے اور نہی عن المنکر کے لیے ہوں کہ یہ منکر کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے تو یہ طریقہ ان شاء اللہ پائے پلٹ کر رکھ دے گا۔

کامیابی کی لازمی شرط بد امنی اور توڑ پھوڑ سے گلی اجتناب

البتہ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ پُر امن ہو۔ یہ نہیں کہ آپ نے ٹریفک سگنل توڑ دیتے۔ ایک چلتی بس ٹھہرائی اور اس کے ماتروں سے ہوا نکال دی۔ اس سے کیا حاصل ہوا؟ — اس بس کے جو ساٹھ ستر مسافر تھے ان کو آپ نے تکلیف پہنچائی۔ نہ معلوم کس کو کتنی دُور جانا تھا۔ یا سرکاری اٹاک اور خاص طور پر سرکار کے زیر انتظام چلنے والی بسوں کو آگ لگا دی۔ معاذ اللہ! وہ بس کسی غیر کی نہیں تھی۔ اس غریب قوم کی تھی جس کا ایک ایک بال بیرونی قرضوں میں بندھا ہوا ہے۔ آپ نے سرکاری اٹاک اور بسوں کو نقصان پہنچا کر اور جلا کر اس غریب قوم پر قرضوں کے بار میں مزید اضافہ کر دیا۔ حکومت یہ کرے گی کہ کوئی نیا غیر ملکی قرضہ لے گی اور اس نقصان کو پورا کر لے گی۔ نتیجہ! یہ کہ قوم قرضوں کے بوجھ تلے مزید دب جائے گی۔ پھر پولیس کی کوئی لاری یا ٹرک آیا تو اس پر پتھر تو شروع کر دیا۔ نتیجہ! یہ کہ پولیس والے جو آپ ہی کے بھائی بند ہیں، آپ کے خلاف مشعل ہو گئے۔ — اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دیکھئے۔ بارہ برس تک مکہ میں حضورؐ پر اور خاص طور پر آپؐ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر تشدد ہوا لیکن کسی نے ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ انہیں مارا گیا، ایک مومن خاوند و بیوی حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ نہایت بہیمانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ حضرت بلالؓ کو سفاکانہ طور پر مکہ کی سنگلاخ اور پتی زمین پر اس طرح گھسیٹا گیا جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے جس کو ایک سلیم الطبع شخص گوارا نہ کرے حضرت خبابؓ کو دھکتے انگاروں پر تنگی پیٹھ لٹایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی کمر کی چربی اور خون سے انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ لیکن کسی کو بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ الغرض ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کا مقصد یدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ وہ جماعت منظم ہو اور اس جماعت کے کارکن تقویٰ، اسلام اور اعتصام بالقرآن کی طریقوں پر کسی نہ کسی درجہ میں قدم رکھ چکے ہوں۔ اس کا عزم مصمم کر چکے ہوں۔ وہ فقہی اختلافات میں الجھنے والے

نہ ہوں۔ وہ جماعت ایک امیر کے حکم پر حرکت کرتی ہو۔ رکنے کو کہا جائے تو رکیں اور بڑھنے کو کہا جائے تو بڑھیں۔ جب تک شکل نہیں ہوگی اسلامی نظام آنے کا امکان پیدا ہوگا نہ منکرات کے خاتمے کی سبیل پیدا ہوگی۔

دومکن نتیجے: اس طریق پر عملی جدوجہد کے دو ہی ممکن نتیجے نکل سکتے ہیں: پہلا یہ کہ حکومت وقت پسپائی اختیار کرے اور ہمارے مطالبات کو مان لے۔

منکرات ختم ہوں، ان کی جگہ معروفات لے لیں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ منظم مظاہروں کے ذریعہ سے پوری شریعت نافذ ہو جائے گی چونکہ ارباب اقتدار کو یہ اطمینان ہوگا کہ یہ جماعت اپنا اقتدار نہیں چاہتی بلکہ اس کا مقصود و مطلب صرف اسلامی نظام ہے۔ چنانچہ انہی کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم و نافذ ہو جائے گا اور فہو المطلوب۔ یاد دوسری شکل یہ ہوگی کہ حکومت مزاحمت کرے۔

اسے اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنا لے اور سبقتدار یا ایوان اقتدار کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہو جو چاہے زبانی کلامی اسلام کے اور اس کے نظام عدل و قسط کے بڑے قصیدہ گو اور مدح سرا ہوں لیکن جن کے قلوب حقیقی نور ایمان سے خالی ہوں تو وہ مزاحمت کریں گے، تصادم ہوگا،

مظاہرین پر لاشعری چارج ہوگا، گولیوں کی بوچھاڑ ہوگی، ان کو جیلوں میں ٹھونسنا جائے گا، قید و بند کی تکالیف ہوں گی۔ ان سب کو اگر یہ جماعت پُر امن طریق پر چھیل جائے وہ مشتعل نہ ہو یعنی وہ

کوئی جوابی کارروائی نہ کرے، نہ جماعت کا کوئی رکن معافی نامہ اور توبہ نامہ لکھ کر جیل سے بچنے کی فکر کرے تو ان شاء اللہ پھر بھی دو نتیجے نکلیں گے۔ یا تو وہ جماعت اس راہ میں قربان ہو جائے گی، کچل

دی جائے گی، تو آخرت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی کامیابی ہے بلکہ اصل کامیابی یہی ہے:-

ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ دوسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ اس جماعت کو اپنے اثبات و قربانی سے

عوام الناس کی عملی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں اور وہ پوری طرح اس کا ساتھ دیں۔ مزید برآں خود پولیس

اور فوج بھی تو مسلمان بھائیوں ہی پر مشتمل ہے۔ ان کی عملی ہمدردیاں بھی اس جماعت کے ساتھ ہو

جائیں گی۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پہلے تو شہنشاہ کے حکم پر پولیس اور فوج نے نظام

کی حد کر دی لیکن جب انقلابی جماعت کے ساتھ عوام الناس کی اکثریت بھی شامل ہو گئی تو فوج

نے گولیاں برسائیں اور پولیس نے لاشعری چارج اور انشک آور گولیوں کی بوچھاڑ کرنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تب ہی توشہنشاہ ایران جیسے جابر شخص کو جس نے اپنے گرواگر دایک قومی ہیرو کی حیثیت سے تقدس کا ہالہ بھی قائم کر رکھا تھا، اپنی جان بچا کر ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ کم و بیش یہی صورت حال سنی کی نظام مصطفیٰ التحریک کے موقع پر پیش آئی۔ بھٹو صاحب نے لاہور اور کراچی میں جزوی نارشل لارنا فائدہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ وقت آیا کہ فوج نے مظاہرین کو گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حال کی وجہ سے بھٹو صاحب کو جھکنا پڑا اور وہ قومی اتحاد کے اکابر سے مصالحت کی گفتگو پر آمادہ ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اس تصادم کا فائدہ کوئی دوسرا اٹھالے گیا۔

ایسی جماعت کے وجود اور مقاصد کے لیے جہاں ہیں اس آیت مبارکہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ: ”وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ وہاں اس کے اصول و مبادی اور شرائط و اوصاف کے لیے رہنمائی اس حدیث شریف سے ملتی ہے جو حضرت عارف الاشعریؒ سے مروی ہے۔ اس کا ترجمہ پھر سن لیجئے۔ حضرت عارف الاشعریؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزام جماعت کا، شیخ و طاعت کا، اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔“ گویا اولاً جماعت درکار ہے، افراد نہیں، ہجوم نہیں، MOB نہیں پھر جماعت بھی ڈھیلی ڈھالی نہیں، چار آنے کی ممبری والی نہیں، صدروں کی ٹانگیں گھسیٹنے والی نہیں بلکہ سچ و طاعت والی۔ پھر اس جماعت کے سامنے مقاصد کیا ہوں گے؟ اللہ کی راہ میں ”ہجرت“ اور ”جہاد“!

ہجرت اور جہاد کی ابتدا اور انتہا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اَيُّ الْهَجْرَةِ اَفْضَلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ ”یا رسول اللہ بہترین اور اعلیٰ ہجرت کون سی ہے؟“ آپ نے فرمایا: اَنْ تَهْجُرَ مَا كُورَ رَبِّكَ ”ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے۔“ گویا یہ ہے ہجرت کا نقطہ آغاز۔ البتہ یہ تہیت کھنی ضروری ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے، اسے قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے گھر بار، اہل و عیال، مال و منال یہاں تک کہ اپنے وطن کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دوں گا۔

یہ نیت ہر مسلمان رکھے۔ لیکن اگر آپ کی زندگی میں کوئی معصیت ہے اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیجئے۔ اسی طرح سے ہجرت کا عمل شروع ہو جانے لگا۔ مزید برآں عوام تو عوام ہمارے اکثر اہل علم بھی اس مغالطہ میں ہیں کہ جہاد کے معنی جنگ کے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہمارے دین کی ایک بڑی وسیع معانی اور مفاہیم رکھنے والی اصطلاح ہے۔ حضورؐ سے پوچھا گیا: اَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ یَا رَسُولَ اللّٰهِ بہترین جہاد کون سا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: اَنْ تَجَاهِدَ نَفْسَكَ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ کہ تم اپنے نفس سے جہاد کرو اور اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔ ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے: "الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ" "حقیقی مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کے خلاف کشمکش کرے" تو جہاد یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اسی جہاد کے اگلے مراحل ہیں غیر اسلامی نظریات، منکرات اور غیر اسلامی نظام کے خلاف کشمکش اور پنجہ آزمائی۔ اسی جہاد کی بلند ترین چوٹی ہے "قتال فی سبیل اللہ"۔ لہذا دل میں یہ نیت رکھنی ضروری ہے کہ اے اللہ! وہ وقت آئے کہ صرف تیرے دین کے غلبہ کے لیے، تیرے کلمہ کی سربلندی کے لیے میری گردن کٹے۔ اس لیے کہ اگر یہ آرزو سینہ میں موجود نہیں ہے تو وہ ایک مومن کا سینہ نہیں ہے حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے نہ تو اللہ کی راہ میں جنگ کی، نہ جنگ کی آرزو اپنے سینہ میں رکھی، نہ شہادت کی تمنا اپنے سینہ میں رکھی تو اگر اس حالت میں اسے موت آگئی تو فَقَدْ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِّنَ الْبِغَاقِ "یعنی ایسا شخص یقیناً ایک نوع کے نفاق پر مر رہا ہے"۔ یعنی حقیقی ایمان پر نہیں مارتا تو یہ ہے "ہجرت و جہاد"۔ ہجرت شروع کہاں سے ہوتی؟ ترکِ معصیت سے اور کہاں تک جاتے گی؟ ترکِ وطن تک۔ جہاد کہاں سے شروع ہوا؟ مجاہدہ مع النفس سے اور کہاں تک جاتے گا؟ قتال فی سبیل اللہ تک۔ لیکن اس لائحہ عمل پر چلنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے جو بیعتِ سمع و طاعت پر قائم ہو۔ البتہ اس کے ساتھ فی المعروف کی شرط ہوگی۔ یعنی یہ کہ یہ سمع و طاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے دائرے کے اندر نذر ہوگی۔

خلاصہ بحث

قصہ مختصر یہ کہ نبی عن المنکر کے اعلیٰ ترین درجے یعنی قوت و طاقت سے منکرات کے استیصال کا طریق کار وہ ہو گا جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا یعنی یہ کہ قرآن کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے ایک ایسی جماعت فراہم کی جائے اور تشکیل دی جائے جو اپنی استقامت سے، اپنے ثبات سے، اپنے صبر سے، اپنے ایثار سے، اپنی قربانی سے، اپنی باہمی محبت سے اور جماعتی طور پر ہجرت و جہاد سے اللہ کے دین کا بول بالا کرے، منکرات کا استیصال کرے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے تو اس آیت کے آخر میں ان کو بشارت دی گئی: **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** "اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے"۔ ایسے موقع پر ہمیشہ دل سے دعا کیا کیجئے: **اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ**۔ اے اللہ ہمیں ان منجھین میں شامل فرما جو تیرے بتاتے ہوئے ان تمام راستوں پر عمل پیرا ہوں۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اپنی انفرادی زندگیوں میں تقویٰ، اطاعت اور فرمانبرداری کی روش اختیار کریں۔ ہم قرآن سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی اور عملی تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ اور اے اللہ! ہمیں بہت دے کہ ہم ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کریں جو سمع و طاعت کی بنیاد پر قائم ہو اور جس کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ **اٰمِنْ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ!**

خطابِ شانے

امریا المعروف اور نہی عن المنکر

باہم لازم و ملزوم



نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

علماء و صلحاء کے کمرے کا اصل کام

اور

عذاب الہی سے نجات کی واحد راہ



ترتیب و تسوید

خالد محمود محضّر

Handwritten text at the top of the page, possibly a title or header.

Handwritten text in the upper middle section of the page.

Handwritten text in the middle section of the page.

Handwritten text in the lower middle section of the page.

Handwritten text in the lower middle section of the page.

Handwritten text in the lower middle section of the page.

Handwritten text at the bottom of the page, possibly a signature or footer.

امت مسلمہ کی غرض تائیس

قرآن مجید کی دو اصطلاحات کے حوالے سے

امت مسلمہ کی غرض تائیس اور اس کے مقصد وجود کے بیان میں قرآن مجید نے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح ذرا فلسفیانہ ہے اور اسے سمجھنے کیلئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ دوسری اصطلاح نسبتاً عام فہم اور آسان ہے۔ قرآن مجید چونکہ عوام اور خواص سب کے لیے کتاب ہدایت ہے، اس میں فلاسفہ و حکماء کے لیے بھی رہنمائی ہے اور عوام الناس کے لیے رہنمائی کا فریضہ بھی اسی کتاب عزیز کو سرانجام دینا ہے، لہذا آپ دیکھیں گے کہ اس میں اگرچہ بڑے گہرے علمی مضامین اور فلسفیانہ مباحث بھی ہیں، لیکن یہ اپنے اصل مقصد کو بڑے عام فہم انداز اور بڑی سلیس زبان میں بھی ادا کر دیتا ہے۔ تاکہ ایک طرف اہل خرد کے لیے سامان غور و فکر مہیا ہو جائے تو دوسری طرف عوام بھی اس کی ہدایت و رہنمائی سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ امت مسلمہ کی غرض تائیس کے لیے بھی اس میں دو اصطلاحات بیان فرمائی گئیں۔ (۱) شہادت علی الناس (۲) امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

ان دو اصطلاحات پر غور کرنے سے پہلے امت کی غرض تائیس کی اہمیت کو سمجھنے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی بھی اجتماعی ہئیت تشکیل دی جائے، خواہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹا ادارہ ہی کیوں نہ ہو، تو سب سے پہلے اس کے اغراض و مقاصد اور اہداف معین کیے جاتے ہیں۔ تو یہ جو اتنی بڑی امت تشکیل دی گئی تو اس کی غرض تائیس کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ امت کے تو معنی ہی ہم مقصد لوگوں کی اجتماعیت کے ہیں۔ عربی زبان میں ”اَمْرٌ - كَيْوَقَرٌ“ کے معنی ہیں ”قصد کرنا، ارادہ کرنا۔ قرآن مجید میں ”حَاجَّجَ کَرَامَ کُو“ اَمِّنَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ“ کہا گیا ہے جو اطراف و اکناف عالم سے بیت اللہ شریف کا قصد کر کے چلتے ہیں۔ ”اَمْرٌ - كَيْوَقَرٌ“

ہی سے لفظ ”اُمّۃ“ بنا ہے، یعنی ایسے لوگوں پر مشتمل اجتماعیت جن کا مقصد ایک ہے، مقصد ایک ہی ہے، ہدف ایک ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں اکثر نے اس اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض تائیس اور اس کے مقصد وجود کے بارے میں کبھی غور بھی نہیں کیا۔ اس اُمت کی رکشیت میں جیسا کہ پہلی طور پر ملی ہے، ہم مسلمان اس لیے بن گئے ہیں کہ ہم اللہ کے فضل سے مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گئے اور اسلام کی یہ دولت ہمیں بغیر کسی ایثار و قربانی اور محنت و مشقت کے اور بغیر کوئی نقصان برداشت کیے ہوئے میسر آگئی۔ لہذا ہم نے اکثر و بیشتر کبھی یہ غور کرنے کی تکلیف تک نہیں کی کہ اس مسلمان ہونے کے تقاضے کیا ہیں! اس اُمت مسلمہ کی غرض تائیس کیا ہے! یہ اُمت آخر کیوں برپا کی گئی ہے! تو آئیے آج اُمت کی اس غرض تائیس کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھیے! جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے، قرآن حکیم نے اس کے لیے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں:

۱۔ شہادت علی الناس

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ

(البقرة: ۱۴۳)

الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

”اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (بہترین اُمت) بنایا، تاکہ تم گواہ ہو جاؤ

لوگوں پر — اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر“

قرآن حکیم کا ایک اصول میں نے بار بار بیان کیا ہے اور میرے دروس کی محافل میں شرکت کرنے والے حضرات نے مجھ سے کئی مرتبہ یہ بات سنی ہوگی کہ مطالعہ قرآن اور اس پر غور و فکر کے دوران میں نے دیکھا ہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں چنانچہ یہ مضمون جو سورۃ البقرہ میں دوسرے پارے کے آغاز میں آیا ہے، سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے، جہاں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ۔ یعنی اللہ کے راستے میں جہاد کرو، محنت اور جدوجہد کرو، جیسا کہ اس کی جدوجہد کا حق ہے۔ هُوَ اجْتَبَاكُمْ: اس نے تمہیں چُن لیا ہے، پسند کر لیا ہے لیکن یہ چناؤ، یہ انتخاب کس لیے ہوا:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ -

”تا کہ رسول گواہ بن جائیں تم پر، اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوری نوع انسانی پر!“
دونوں مقامات پر مضمون ایک ہی ہے، صرف ترتیب کا فرق ہے۔ سورۃ البقرہ میں امت کا ذکر پہلے ہے اور رسول اللہ کا ذکر بعد میں۔ جبکہ سورۃ الحج میں رسول اللہ کا ذکر پہلے ہے اور امت کا بعد میں۔

”شہادت علی الناس“ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر اسلام کا فلسفہ شہادت کے عنوان سے میرے کیسٹ موجود ہیں۔ اس ”شہادت علی الناس“ کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف۔ آپ اگر کسی مقدمے میں بطور گواہ پیش ہوتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آپ کی گواہی ایک فریق کے حق میں جاتی ہے اور دوسرے کے خلاف جاتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی گواہی کے یہ دونوں پہلو آئے ہیں۔ کسی کے حق میں گواہی کو ”ل“ کے ساتھ اور کسی کے خلاف گواہی کو ”علی“ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا هَوًّا أَمِينًا بِالْقِسْطِ شَهِدَاءَ لِلَّهِ یعنی اے ایمان والو! اللہ کے حق میں گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ اپنی زبان اور اپنے عمل سے اللہ کی توحید اور اس کے دین کے گواہ بن جاؤ؛ تمہارا ہر عمل گواہی دے رہا ہو کہ تم اللہ کے ماننے والے ہو، تمہارا ہر عمل پکار پکار کر لوگوں کو بتا رہا ہو کہ یہ محمد عربی کے نام لیا ایں۔ یہ گواہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے، جسے علامہ اقبال نے کہا ہے ع دے تو بھی محمد کی صداقت کی گواہی؛ لیکن یہ گواہی کسی کے خلاف بھی پڑ رہی ہے۔ آپ نے جب دنیا کے سامنے دین کی تھانیت اور محمد رسول اللہ کی صداقت کی گواہی دے دی تو اب ان کے اوپر ایک گواہی قائم ہو گئی۔ اب قیامت کے دن وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکیں گے کہ اے اللہ ہمارے سامنے تو تیرا دین آیا ہی نہیں، ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ اللہ کیا چاہتا ہے، ہمیں تو کسی نے نہ تیرے ساتھ متعارف کرایا، نہ تیرے رسول کے ساتھ اور نہ تیرے کلام کے ساتھ ایہ ہے لوگوں پر گواہی کا قائم ہونا جو قیامت کے دن ان کے خلاف پڑے گی۔ اس لیے کہ اگر لامعی ہو تو پھر بھی کوئی عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ اے اللہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اگرچہ آپ کو معلوم

ہے کہ دنیا میں تو عدالت کا اصول یہ ہے کہ 'IGNORANCE OF LAW IS NO EXCUSE'

آپ کو اگر قانون معلوم نہیں ہے تو آپ عذر نہیں پیش کر سکتے۔ قانون چاہے آپ کے علم میں ہو، چاہے نہ ہو، آپ قانون کی گرفت میں آئیں گے۔ لیکن عدالت اُفروہی میں معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہاں لاعلمی بھی ایک عذر کے درجے میں آجاتے گی۔ لہذا اللہ رسولوں کو بھیجتا رہا تاکہ لوگ لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکیں۔ رسول اپنے قول و عمل اور کردار سے گواہی دے دیں کہ یہ ہے دینِ حق، یہ ہے اللہ کا دیا ہوا راستہ جس پر میں چل کر دکھا رہا ہوں۔ یہ راستہ ناقابلِ عمل بھی نہیں ہے، دیکھو میں تم جیسا انسان ہوں، مجھے بھی پیٹ لگا ہوا ہے، میری بھی احتیاجات ہیں میرے بھی بال بچے ہیں، زندگی کے تمام تھکنے میرے ساتھ بھی ہیں، پھر بھی میں اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزار رہا ہوں تو اس طرح سے لوگوں پر رحمت قائم ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت انبیاء و رسول کے مقصدِ بعثت کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین اصطلاح ہے۔

چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم ہو رہا تھا، لہذا یہ ذمہ داری اجتماعی طور پر امانت کے سپرد کر دی گئی۔ اب انہیں اپنے قول و عمل سے انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ گواہی دینی ہے۔ اور یہی امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ تاسیس ہے، لہذا آئے الفاظ قرآنی: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں لوگوں سے گواہی لے لی: اے اہلِ بِلَغْتُہِ "لوگو! میں نے پہنچا دیا ہے اور سوا لاکھ کے مجمع نے بیک زبان کہا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔" ہاں حضور، ہم گواہ ہیں، آپ نے حق رسالت ادا کر دیا، حق امانت ادا کر دیا، حق نصیحت ادا کر دیا۔ پھر اللہ کی جناب میں عرض کیا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ "اے اللہ تو بھی گواہ رہ!" اب میری ذمہ داری ختم ہو گئی، میرا فرض منصبی ادا ہو گیا۔ پھر لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: فَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ "پس اب پہنچائیں وہ جو موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں۔" یعنی اب یہ ذمہ داری میرے کندھوں سے اتر کر تمہارے کندھوں پر آگئی ہے۔ اب تمہیں یہ پیغام چار دانگ عالم میں پہنچانا ہے، اس لیے کہ میں صرف تمہارے لیے ہی رسول بن کر نہیں آیا تھا، بلکہ میں تو پوری نوبِ انسانی کے لیے رسول

بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں تو تا قیام قیامت اللہ کا رسول ہوں۔ جتنے انسان اس وقت دنیا میں ہیں اور جتنے انسان تا قیام قیامت آئیں گے میں اُن سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اب یہ شہادت جو میں نے تم پر دی ہے تمہیں دینی ہے پوری نورِ انسانی پر!

بدقسمتی سے ہمارے ہاں لفظ شہادت کے صرف ایک ہی معنی عام ہو گئے، یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا ہی شہادت ہے۔ اور شہید کا صرف یہی ایک مفہوم رہ گیا کہ جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہو مارا جائے۔ قرآن حکیم 'شاہد' اور 'شہید' کے الفاظ انبیاء و رسل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے تمام رسول شہید ہیں، حالانکہ رسول اللہ کی راہ میں قتل نہیں ہوئے۔ نبی ضرور قتل ہوتے ہیں، لیکن رسول کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود تمام رسول شہید ہیں۔ سب اللہ کے گواہ ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے عمل سے گواہی دیتے ہوئے بسر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدٌ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ (النساء: ۴۱)

”اُس دن کیا کیفیت ہوگی جبکہ ہم ہر امت پر ایک گواہ لاکھڑا کریں گے اور اے نبیؐ آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان پر!“

جس امت کی طرف جو رسول بھیجے گئے وہ اُس عدالتِ اخروی میں شہادت دیں گے؛

TESTIFY کریں گے۔ رسول سرکاری گواہ (PROSECUTION WITNESS) کی حیثیت سے کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ تیرا دین اور تیرا پیغام جو مجھ تک آیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ اب یہ خود ذمہ دار اور متول ہیں۔ اور پھر آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے اور اپنی امت کے بارے میں TESTIFY کریں گے کہ اے اللہ میں نے انہیں تیرا دین پہنچا دیا تھا۔ اب اپنے طرزِ عمل کے ذمہ دار اور متول یہ خود ہیں۔ پھر امت مسلمہ کو کھڑے ہو کر یہی شہادت دینا ہوگی۔ اور اگر نہ دے سکی تو وہ گویا کہ دوسروں سے پہلے مجرم ہوگی۔ دوسروں کو دین کا پیغام پہنچانا اس کے ذمہ تھا، اگر اس نے نہیں پہنچایا تو دوسروں کی نافرمانی اور گمراہی کا وبال بھی اس پر آئے گا۔

(۲) امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امتِ مسلمہ کی غرض تائیس کے لیے قرآن حکیم میں آسان تر اصطلاح ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر“ کی اختیار کی گئی ہے۔ سورۃ آل عمران میں امت کی غرض تائیس کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران آپس میں نہیں ہیں یعنی یہ دونوں سورتیں ایک جوڑ ہیں۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ - (ال عمران: ۱۱۰)
”تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہو،
بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“

دنیا کی قومیں اپنے لیے زندہ رہتی ہیں، اپنے لیے جدوجہد کرتی ہیں، اپنی ترقی، اپنی عظمت، اپنی سر بلندی اور اپنے لیے قوت و سطوت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ لیکن اے مسلمانو تمہیں دنیا والوں کے لیے زندہ رہنا ہے۔ جیسے اقبال نے شکوہ میں کہا ہے۔
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترانام ہے کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام ہے!
تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالے گئے ہو۔ تمہارا کام کیا ہے؟ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
نیکی کا حکم دو! وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اور بدی سے روکو! وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔ اور اللہ پر
ایمان بخیر رکھو!! یہاں اس بات کو پھر ذہن میں تازہ کیجئے کہ اہم مضمون قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سورۃ مبارکہ میں یہ مضمون اس انداز سے آیا:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (ال عمران: ۱۰۴)
”اور تم میں ایک امت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور

بدی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں“

ان دو آیات کے مابین ربط ملاحظہ کیجئے۔ پہلی آیت صحابہ کرامؓ کو خطاب کر رہی ہے۔

صحابہ کرامؓ وہ حضرات تھے جن میں سے ایک ایک فرد کو یہ معلوم تھا کہ میرا فرض منصبی کیا ہے۔ میں کس لیے امت محمدؐ میں شامل ہوا ہوں، بحیثیت امتی میری ذمہ داری کیا ہے۔ لہذا وہاں مجموعی طور پر امت کو خطاب کیا گیا: کُنْتُمْ حَیْرَ اُمَّتٍ... الخ یعنی اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) تم بہترین امت ہو، بہترین جماعت ہو، پوری انسانی تاریخ کے اندر بہترین گروہ ہو، جو لوگوں کے لیے نمائے گئے ہو ان کی مصلحتی اور بہبود کے لیے ان کی آخرت سنوارنے کے لیے، انہیں حق کی طرف بلانے کے لیے، انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے، انہیں ظلم و ستم کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے۔ اور تمہارا تو فرض منصبی ہی نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہے لیکن دوسری آیت درحقیقت اُس دور کے لیے ہے جب امت اپنے فرض منصبی کو بھول چکی ہو۔ جیسے مثلاً آج کا دور ہے۔ آج ہم یہ سمجھے بیٹھیں کہ ہم بھی ایک قوم ہیں جیسے دنیا میں اور قومیں ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد کو بھی اسی لیے جینا ہے اور دوڑ بھاگ کرنی ہے جیسے کوئی ہندو، کوئی سکھ اور کوئی پارسی اپنی معاش کے لیے اپنی اولاد کی پرورش کے لیے، اپنا گھربنانے، اس کو سجانے اور ساز و سامان جمع کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ہم نماز پڑھ لیتے ہیں، وہ جانا چاہتا ہے تو کسی مندر میں چلا جاتا ہے۔ اور ہم میں بھی نماز پڑھنے والے کتنے رہ گئے ہیں بے پھر یہ کہ اجتماعی سطح پر جو ان کے اہداف اور مقاصد ہیں وہی ہمارے مقاصد ہیں۔ ان کا بھی زور چلتا ہے تو وہ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، دوسروں کی بینیں پھین لیتے ہیں، دوسروں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں، ہمارا بھی داؤ لگتا ہے تو ہم بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا دورِ زوال کہ امت بھول گئی کہ ہماری غرض تائیس کیا تھی، ہمارے مقاصد کیا تھے، ہمارا نصب العین کیا تھا!

اس دورِ زوال کے لیے قرآن حکیم یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اس امت میں سے کچھ لوگ جو بیدار ہو جائیں، جو ہوش میں آجائیں، جنہیں اپنا مقصد وجود یاد آجائے وہ دوسروں کو جگائیں، بچوں کے لیے ’ہمدرد‘ کا جو رسالہ ’نو نہال‘ نکلتا ہے اس میں آپ نے ایک عنوان دیکھا ہو گا ’سجاگو‘ اور جگائو! مجھے یہ SLOGAN بہت پسند ہے۔ یہ بڑی اچھی اور عام فہم اصطلاح ہے۔ خود جاکو! اور جو جاک جائیں وہ دوسروں کو جگائیں، خواب غفلت سے بیدار کریں۔ جنہیں یہ ہوش آگیا ہے کہ

میں مسلمان ہوں، یہ میری ذمہ داری ہے، میں تو بحیثیت مجموعی اُس امت کا فرد ہوں جو دنیا والوں کی بھلائی کے لیے برپا کی گئی ہے، میرے ذمے تو بڑا عظیم فریضہ ہے، ایسا فریضہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے سپرد کرتا رہا ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ، یہ اب دوسروں کو جگاتیں۔ اس طرح جو جاگتے جاتیں وہ ایک امت بن جاتیں، امت میں ایک چھوٹی امت — جیسے آپ کہتے ہیں 'PARTY WITHIN PARTY' اور 'STATE

WITHIN STATE' ایک تو بڑی امت ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُمتی اس وقت دنیا میں ایک ارب سے زیادہ کی تعداد میں ہیں، لیکن سوتے ہوتے ہیں۔ کس اعتبار سے سوتے ہیں؟ دنیا کے اعتبار سے سوتے ہوئے نہیں ہیں، ہر شخص اپنی بہتری کے لیے کوشاں ہے، زور لگا رہا ہے، دن رات محنت کر رہا ہے۔ البتہ دین کے اعتبار سے سو گئے ہیں۔ بحیثیت امت محمد جو ذمہ داری تھی، اس کے اعتبار سے سو گئے ہیں۔ تو جو جاگ جاتیں وہ ان سونے والوں کو جگاتیں۔ اور آپس میں مل جل کر اس بڑی امت میں ایک چھوٹی امت بناتیں۔ وَلَقَدْ كُنَّا مِنْكُمْ أُمَّةً يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ ”تم میں سے ایک امت تو ایسی لازماً ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔“ اور اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور پر نوٹ کیجئے: وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَالِحُونَ۔ ”اور یہ جان لو کہ صرف وہی ہوں گے فلاح پانے والے۔“ یہ سوتے ہوئے فلاح نہیں پائیں گے۔ جو جاگ جاتیں گے اور دوسروں کو جگائیں گے اور جو اپنے اس دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض منصبی کو ادا کریں گے، صرف وہ ہوں گے فلاح پانے والے۔ آپ صدق دل سے دعا کیجئے: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔ اے اللہ ہمیں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرما!

اُمربالمعروف اور نہی عن المنکر

لازم و ملزوم ہیں

قرآن حکیم 'اُمربالمعروف اور نہی عن المنکر' کو ایک وحدت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ

دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کی حیثیت ایک حیاتیاتی اکائی (ORGANIC WHOLE)

کی سی ہے۔ لیکن قسمتی سے ہمارے اس دُور میں بہت سے انتہائی نیک اور نیک نیت لوگ جو دین کے لیے حرکت اور جِد و جہد بھی کر رہے ہیں، جو اپنے گھروں سے دین کی محنت کیلئے نکلتے ہیں، ایک مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ صرف نیک کی تلقین کفایت کرتی ہے، نہی عن المنکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی پر تنقید کا کوئی فائدہ نہیں، بھلائی کو بھیلادو، بھلائی کی تلقین کرو، جب بھلائی پھیلے گی تو بدی خود بخود رفع ہو جائے گی! بعض اعتبارات سے یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ تم روشنی بھیلادو، تاریکی خود بخود کافور ہوتی چلی جائیگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اور دینی اعتبار سے بہت بڑی غلط فہمی ہے جس میں یہ حضرات گرفتار ہیں۔ ان کا مجاہدانہ کردار اور دین کے لیے ان کی محنتیں مسلم ہیں۔ ان حضرات کے دم قدم سے دین کے نام پر پوری دنیا میں ایک بہت بڑی حرکت موجود ہے۔ ان کے بیس بیس اور کچیس کچیس لاکھ کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی نیک نیتی سے اپنا وقت اور مال خرچ کرتے ہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے 'نہی عن المنکر' کا معاملہ معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج آپ قرآن حکیم کے نو مقامات کے حوالے سے اس بات کو سمجھ لیں اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اُمربالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں، یہ ایک گاڑی کے دو پہیے یا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ آپ دو پہیوں والی گاڑی کو ایک پہیے پر چلائیں گے تو وہ آگے نہیں بڑھے گی، وہ اپنے AXIS پر گھوم جائے گی اور چکر لگائے گی۔ گاڑی دو پہیوں پر ہی آگے بڑھتی ہے۔ ان دونوں کو جدا کرنا حکمت قرآنی اور نشائے الہی کے خلاف ہے۔ میں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ

کہے کہ قرآن مجید تو یہ دو چیزیں بیان کر رہا ہے، لیکن اصل میں تو ایک ہی چیز ضروری ہے تو معلوم یہ ہوا کہ اس نے قرآن مجید پر طعن کیا ہے، گویا کہ اللہ کے کلام میں نقص نکالا ہے کہ شاید یہ صرف شاعری ہو رہی ہے، محض لغازی ہو رہی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ قرآن اگر ان دونوں چیزوں کو ایک یکجا اصطلاح کے طور پر لارہا ہے تو وہ بلا مقصد نہیں لارہا۔

اب ہم ان نو مقامات کا ایک ایک کر کے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر مقام کے لیے میں نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

۱۔ شانِ باری تعالیٰ _____ النمل: ۹۰

یہ آیت مبارکہ آپ میں سے ہر شخص کو یاد ہوگی، کیونکہ ہر خطبہ جمعہ کے اختتام پر آپ یہ آیت سنتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ
وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

”یقیناً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور قربت داروں کا حق ادا کرنے کا
_____ اور روکتا ہے بے حیائی سے، برائی سے اور سرکشی سے۔ تم کو سمجھاتا ہے،
تا کہ تم یاد رکھو۔“

یہ آیت مبارکہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان بیان کر رہی ہے کہ وہ خود نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ یہ آیت شریعت کے لیے ایک SYMBOL کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ شریعت نام ہی اوامر و نواہی کا ہے۔ اس آیت میں کس قدر خوبصورت توازن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کا حکم دیا اور تین باتوں سے روکا۔ حسن توازن کے ساتھ ساتھ اس میں حسن ترتیب بھی ہے۔ اس وقت ان آیات کا درس یا تفسیر مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ حقیقت آپ کے پیش نظر رہے کہ امر اور نہی دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ اللہ اگر نیکیوں کا حکم دیتا ہے تو بدیوں سے روکتا بھی ہے۔ ورنہ اگر وہ فلسفہ درست ہوتا کہ محض نیکی کی تلقین سے بدی خود بخود ملیا میٹ ہو جاتے گی تو بدی کی نشاندہی کر کے اس سے روکنے کی اضافی طور پر ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ تقاضائے فطرت و حکمت — لقن: ۱۷

حضرت لقمان کے بارے میں آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ وہ نبی تھے، نہ کسی نبی کے اُمّی تھے وہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل حکیم و دانایان انسان تھے۔ انہوں نے اپنے غور و فکر سے جو نتائج اخذ کیے ان کی جھلک ان کی نصیحتوں میں ملتی ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ لقمان کا دوسرا کونچ ان کی ان وصیتوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ ان وصیتوں کا آغاز اس آیت مبارکہ سے ہوتا ہے: **وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَبْنَىٰ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ**۔ اس طرح قرآن حکیم نے حضرت لقمان کو امر بنادیا ہے اس لیے کہ جب تک قرآن موجود ہے اُن کا ذکر موجود ہے۔ اور قرآن تو ہمیشہ رہے گا، لہٰذا ان کا ذکر بھی ہمیشہ موجود ہے گا۔ تو اللہ نے اس انداز سے اپنے اُس بندے کی شان بڑھائی ہے۔ قرآن مجید میں اس طریقے سے تعین کے ساتھ یا تو رسولوں کا نام آتا ہے یا صحابہ کرام میں سے حضرت زیدؓ کا نام آیا ہے۔ صحابہؓ حضرت زیدؓ کا ذکر خاص طور پر اس اعتبار سے کیا کرتے تھے کہ یہ کس قدر خوش قسمت ہیں کہ ان کا نام قرآن میں آیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت **فَلَمَّا هَضَمُوا زَيْدَ قُنُوسًا وَطَارَ الْخُفَىٰ** کے حوالے سے لوگ رشک سے کہا کرتے تھے کہ زیدؓ، تمہارا نام قرآن میں آیا ہے۔ ایسے ہی حضرت لقمان کا نام قرآن میں آکر دوام حاصل کر گیا۔ یہ حکیم و دانایان انسان اپنی فطرت سلیمہ اور عقل صحیح کی روشنی میں بڑی بڑی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر گئے۔ اسی لیے میں نے یہاں عنوان قائم کیا ہے ”تقاضائے فطرت و حکمت“ قرآن حکیم میں ان کی وصیت نقل فرمائی گئی:

يَبْنَىٰ أَقْبِرِ الصَّلَاةَ وَامْرُءًا مَّعْرُوفًا وَانَّهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْدِرْ عَلَىٰ مَا آصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝

”اے میرے بیٹے، نماز قائم رکھ، نیک امرا سے دوستی کر، بدی سے روک، اور بھروسہ کر اُس پر جو

تجربہ پر مبنی! بے شک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔“

دیکھیے، کتنی پیاری بات ہے نیکی کی تلقین پر کبھی آپ کو کسی رد عمل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لوگ سن لیں گے، مانیں یا نہ مانیں۔ آپ کسی سے کہیں کہ بھلا کام کیا کرو، نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو تو اس پر کوئی پلٹ کر آپ کو گالی نہیں دے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جیسے چکنے گھڑے

پر پانی پڑتا ہے تو پھسل جاتا ہے، اس طرح لوگ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیں۔ لیکن اصل میں لوگوں کی طرف سے جوابی کارروائی اُس وقت ہوتی ہے جب آپ انہیں بدی سے روکیں۔ اُس وقت پھر RESENTMENT اور RETALIATION ہوتی ہے۔ آپ چھوٹے سے بچے سے یہ کہہ کر دیکھیے کہ ”بیٹے یہ کھیلنے کی جگہ نہیں ہے، یہ کرکٹ کا میدان نہیں ہے، یہ شرک ہے، تمہاری گیند کی کاسٹر پھوڑ دے گی، کسی کی گاڑی کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔“ لیکن یہ کہہ کر پھر وہاں سے آپ کا اپنی عزت کو سالم لے کر واپس چلا آنا آسان نہیں ہو گا۔ اس طرح کی چھوٹی سے چھوٹی بات کسی سے کہہ کر دیکھ لیجئے، وہ اسے برداشت نہیں کرے گا۔ اسی لیے حضرت عثمان نے فرمایا: **وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ** — یعنی بدی سے روکنے پر جو تجھ پر بیٹے پھرا سے پھیل، اس پر صبر کر! یہی توربط ہے سورۃ العصر کے مضامین میں کہ **وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ**، کے ساتھ **وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ** کا حکم بھی دیا گیا۔ حق کی وصیت کر کے ظاہر بات ہے کہ پھر آپ کو صبر کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔

۳۔ شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم — الاعراف: ۱۵۷

اس آیت مبارکہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تیس راتوں کے لیے کوہ طور پر بلالیا، اور پھر اس مدت کو بڑھا کر چالیس راتیں کیا گیا، تو ان کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ اس پر حکم دیا گیا کہ ہر قبیلے میں سے جو لوگ توحید پر قائم رہے وہ اپنے اُن رشتہ داروں کو ذبح کریں جنہوں نے شرک کا از کتاب کیا جنہوں نے اسلام لانے کے بعد اور نبی کے ساتھی ہونے کے بعد گائے کی پرستش کی ان کے لیے توبہ کی یہ صورت مقرر کی گئی۔ چنانچہ تاریخ انسانی کی اس سب سے بڑی توبہ میں، جسے آج کی اصطلاح میں 'PURGE' کہا جاسکتا ہے، ستر ہزار یہودی قتل کیے گئے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام ستر سرکردہ لوگوں کو لے کر کوہ طور پر حاضر ہوئے اور دعا کی کہ پروردگار ہم سے خطا ہو گئی ہے تو معاف فرمادے، اور ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرمادے! اس کا جواب دیا گیا: **وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ** الخ۔ یعنی ایک تو میری رحمت عام ہے جو ہر شے کو غلطیے لیکن ایک میری خاص رحمت ہے جو میں نے کھ دی ہے اپنے اُن پرہیزگار بندوں کے لیے جو میرے رسول نبی امی صلی اللہ

علیہ وسلم) پر ایمان لائیں گے۔ (اللہ کرے کہ میں اور آپ ان لوگوں میں شامل ہو جائیں۔) اس آیت مبارکہ میں ان نیک بندوں کا ذکر اور رسول نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان ہوتی ہے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ
يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ.

”وہ لوگ کہ جو پیروی کریں گے میرے رسول نبی امی کی جس کو وہ مکتوبہ پائیں گے اپنے پاس

لکھا ہوا تورات اور انجیل میں۔ (وہ نبی) انہیں نیکیوں کا حکم دیں گے، بدی سے روکیں

گے، ان کے لیے طیب چیزوں کو حلال ٹھہرائیں گے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہرائیں گے۔

رسول نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان مبارک کے بیان میں پہلی چیز وہی گاڑی کے
دوپٹے ہیں: يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

۴۔ شان صحابہ رضی اللہ عنہم ————— التوبہ: ۷۱

آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں درجہ بدرجہ ایک ایک سیڑھی اتر رہا ہوں — سب سے
اوپر شان باری تعالیٰ، دوسرے نمبر فطرت سلیمہ جس کے لیے قرآن حکیم میں الفاظ آتے ہیں:
فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ تیسرے نمبر پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اب چوتھے
نمبر پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ سورۃ التوبہ میں صحابہ کی شان یہ بیان فرمائی گئی:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

”اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں نیکی
کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں...“

اللَّهُمَّ وَبِنَا جَعَلْنَا مِنْهُمْ۔

۵۔ کیفیت منافقین ————— التوبہ: ۷۷

شان صحابہ کا ‘CONVERSE’ منافقین کی کیفیت میں دیکھا جاسکتا ہے سورۃ التوبہ

ہی کی آیت ۶۷ میں کیفیت منافقین ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :

الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ
بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ الخ

”منافی مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے ہیں۔ (یہ ایک دوسرے کے

ساتھی، مددگار اور پشت پناہ ہیں)۔ نیکی سے روکتے ہیں اور بدی کا حکم دیتے ہیں۔“

معلوم ہو کہ آپ اس عمل کو معکوس بھی کر دیں تو بھی یہ ایک وحدت ہی رہے گا۔ آپ انہیں تقسیم نہیں کر سکتے۔ یا تو کروار وہ ہوگا کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا — اور یا پھر کرا یہ ہو جائے گا کہ بدی کا حکم دینا اور نیکی سے روکنا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: کَيْفَ بِكُمْ إِذَا لَمْ تَأْمُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ ”تم لوگوں کا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کا حکم دینا چھوڑ دو گے اور بدی سے روکنا چھوڑ دو گے؟“ صحابہ حیران ہوئے۔ ان کے لیے تو یہ ناقابل قیاس اور ناقابل گمان بات تھی۔ انہوں نے کہا: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَإِنْ ذَلِكَ لَكَائِنْ؟ ”اے اللہ کے رسول! کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟“ آپ نے فرمایا: فَعَمْ، وَأَشَدُّ، كَيْفَ بِكُمْ إِذَا أَمَرْتُمْ بِالْمُنْكَرِ وَخَصَيْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوفِ؟ ”ہاں! (تم اسی پر حیران ہو رہے ہو میرے صحابہ!) اس سے بھی شدید کیفیت پیدا ہو جائے گی، اور اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم بدی کا حکم دو گے اور نیکی سے روکو گے؟“ یہ وہ کیفیت ہے جو قرآن حکیم میں منافقین کی بیان فرمائی گئی۔ گویا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک وقت آنے کا جب میری امت میں نفاق عام ہو جائے گا۔ آج آپ کا معاشرہ یہی تصویر پیش کرتا ہے۔ نیکی کے راستے پر چلنا بہت مشکل ہے، جبکہ بدی کے راستے کشادہ ہیں اور ان پر کوئی مزاحمت نہیں۔ کوئی نوجوان ذرا وارٹھی رکھ لے تو مارا رشتہ دار اعزہ و اقارب حتیٰ کہ والدین سب اسے طعن و تشنیع کا ہدف بنائیں گے کہ تم نے یہ کیا کیا؟ ذرا گھر میں شرعی پردہ نافذ کر کے دیکھیے، آپ اپنے معاشرے سے نکال دیئے جائیں گے، آپ کا تعلق آپ کے عزیزوں سے کٹ جائے گا۔ اب ذرا اسی حدیث کا آخری ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔ جب صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کی اس پیشگوئی پر مزید تعجب کا اظہار کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟ تو

آپ نے فرمایا: نَعَمْ، وَأَشَدُّ، كَيْفَ يَكُفُّ إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَعْرُوفَ مُنْكَرًا وَالْمُنْكَرَ مَعْرُوفًا
 ”ہاں، بلکہ معاملہ اس سے بھی شدید تر ہوگا، اور اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کو بدی جاننے
 لگو گے اور بدی کو نیکی سمجھنے لگ جاؤ گے! یعنی میری امت پر ایسا دُور بھی آنے والا ہے جب
 خیر و شر کی تمیز تک ختم ہو جائے گی۔ نیکی کو بدی سمجھا جائے گا اور بدی لوگوں کو نیکی دکھائی دے
 گی۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ ۝

۶۔ امت کا فرض منصبی ————— آل عمران: ۱۰۱

اس آیہ مبارکہ کا مطالعہ ہم پہلے ہی ”امت مسلمہ کی غرض تائیس“ کے ضمن میں قدرے
 وضاحت کے ساتھ کر چکے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
 بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
 ”تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی
 سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

۷۔ دُورِ وال میں امت مسلمہ کے لیے نیکاتی لائحہ عمل کا نقطہ عروج — آل عمران: ۱۰۴

سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں ”امت مسلمہ کے لیے لائحہ عمل“ کے
 موضوع پر میں نے آپ کے اسی شہر کراچی میں ایک مسجد میں آج سے چار سال قبل ایک مفصل
 خطاب کیا تھا۔ اس میں میں نے واضح کیا تھا کہ بگڑے ہوئے موجودہ حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے
 صورت حال کس طریقے سے تبدیل ہو، اس کے لیے قرآن میں کیا لائحہ عمل دیتا ہے۔ قرآن
 مجید تو ہمیشہ کے لیے ہدایت و رہنمائی ہے۔ اس نے اُس دُور کے لیے بھی ہدایت فراہم کی جس
 میں یہ نازل ہوا اور بعد والے ادوار کے لیے بھی ہدایت و رہنمائی دی ہے۔ چنانچہ اس دُورِ وال
 میں اگر ہمیں اوپر اٹھنے کے لیے لائحہ عمل درکار ہے تو بھی ہمیں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔
 قرآن مجید نے مذکورہ تین آیات میں ایک تسلسلہ نیکاتی لائحہ عمل دیا ہے، جس میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ
 ہر شخص تقویٰ اختیار کرے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کل حل کر اللہ کی رسی یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے

تھام لو اور بنیانِ موصوف بن جاؤ، اور اس کا تیسرا نکتہ اور ذرۃٴ منام یہ ہے کہ تم میں ایک جماعت تو ایسی قائم ہونی چاہیے جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ
”تم میں سے ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے

اور بدی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

قرآن نے جس جماعت کی ضرورت پر زور دیا ہے اس کے کرنے کے بس تین کام ہی بتاتے ہیں۔ (۱) خیر کی طرف دعوت (۲) نیکی کا حکم اور (۳) بدی سے روکنا۔ میں یہاں پر عرض کروں کہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری دینی جماعتیں بھی اپنے اصل ہدف سے ہٹ چکی ہیں۔ اپنے آپ کو پاور پوائنٹس میں لٹوٹ کر لینا، کبھی کسی کا پانسنگ اور کبھی کسی کا ضمیر بن جانا اور سیاسی اعتبارات سے ادھر سے ادھر لڑھکتے پھرنے، یہ سب درحقیقت اپنے اصل ہدف سے ہٹ جانے کی بنا پر ہے۔

ع آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف !

مذکورہ بالا تین آیات کی روشنی میں میں نے جو تقریر ۱۹۸۵ء میں یہاں کی تھی اسے مجائی جمیل الرحمن صاحب نے ٹیپ سے اتار لیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کے لیے سُنَّ نکاتی لائحہ عمل کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ (اللہ تعالیٰ مجائی جمیل الرحمن صاحب کو جزائے خیر دے کہ میری بہت سی تقریریں انہی کے ذریعہ سے کتابی شکل میں آتی ہیں) یہ ایسا کتابچہ ہے جسے بڑے پیمانے پر عام کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے میں جولا لائحہ عمل دیا ہے اسے اپنانے بغیر اس قعرِ مذلت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ غزوہٴ جنین کے موقع پر جب آنحضورؐ اپنے جاں نثار صحابہؓ کے ساتھ ایک تنگ پہاڑی درے سے گزر رہے تھے تو وہاں پہلے سے موجود کفار کی جانب سے تیروں کی اچانک بوچھاڑ سے ایک جھگڑ پُچ گئی تھی۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آواز بلند کی: اَللّٰی یَا عِبَادَ اللّٰہِ، اَللّٰی یَا عِبَادَ اللّٰہِ! اے

اللہ کے بندو، کہہ رہا ہے ہو بہ میری طرف آؤ! آج قرآن یہی پکار لگا رہا ہے: ایا عباد اللہ!
 آؤ، میری طرف آؤ! دعائے سونے اور آگے تیار ت کنہ! قرآن پکار رہا ہے کہ آؤ، میرے پاس پڑ کر کم
 اور لائحہ عمل ہے، میرے پاس ہدایت ہے۔ لیکن تم نے مجھے اپنا امام بنایا ہی نہیں یہی وجہ
 ہے کہ میں نے اس کتابچے کا انتساب اُن باہمت افراد کے نام کیا ہے جو قرآن حکیم کو واقعہً اپنا
 امام اور رہنما بنانے کا فیصلہ کر لیں!

۸۔ اصحاب اقتدار کا فرض عین — الحج: ۴۱

اس سلسلے کا آٹھواں مقام سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ پر مشتمل ہے، جہاں ایک اسلامی
 حکومت کے ارباب اختیار و اقتدار کے بنیادی اور اہم ترین فرائض گنوانے گئے ہیں:
 الَّذِينَ اِنْ مَكَنْتُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا الزَّكَاةَ
 وَآمَرُوا بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاللّٰهُ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ
 ”وہ لوگ کہ جنہیں اگر ہم زمین میں اختیار و اقتدار عطا فرمادیں تو وہ نماز قائم کریں گے،
 زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔۔۔۔۔“

یہ آیات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہ اُس وقت نازل ہوئیں جب رسول اللہ ﷺ
 علیہ وسلم ہجرت فرماتے ہوئے مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے، جہاں ایک اسلامی حکومت
 کا قیام عمل میں آنا تھا۔ تو یہ گویا کہ ”حزب اللہ“ کا منشور (MANIFESTO) ہے کہ وہ لوگ جو حقیقتہً ایمان
 اور اسلام پر عمل پیرا اور کاربند ہوں، انہیں اگر اللہ اقتدار عطا فرمائے تو وہ کیا کریں گے! یہاں بھی نظام
 صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ کے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ایک
 وحدت کے طور پر کیا گیا ہے۔

۹۔ سرفروش اور جانباز اہل ایمان کے اوصاف کا ذرۃ نسام — التوبہ: ۱۱۳

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِآتٍ
 لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ
 وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِيْ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ط

وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي
بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ التَّائِبُونَ الْعِدُونَ
الْحِمْدُونَ السَّاعُونَ الزَّكِيُّونَ السَّجِدُونَ الْآمِرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ
لِحُدُودِ اللَّهِ ۖ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

”اللہ نے اہل ایمان سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ (لہذا) وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ (جنت کا یہ) وعدہ حق ہے، اس کے ذمے ہے۔ (اللہ نے اس وعدے کی توثیق کی ہے) تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں منانا اپنی اس تجارت پر جو تم نے اس سے کی ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ (ان کے اوصاف یہ ہیں کہ) وہ توبہ کرنے والے ہیں، (اللہ کی) بندگی کرنے والے، حمد کرنے والے، (لذاتِ دنیوی سے) کنارہ کشی کرنے والے، (اللہ کی بارگاہ میں) رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور (اے نبی) خوشخبری سنا دیں اہل ایمان کو۔“

ان آیات کا آغاز ہوتا ہے کہ اللہ نے تو اہل ایمان سے اُن کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ یعنی جو بھی با شعور صاحب ایمان ہے وہ گویا اللہ کے ساتھ ایک بیع و شراء کر چکا، اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکا۔ لہذا اسی کا منظر یہ تھا کہ صحابہ کرام سرفروشی اور جاں فشانی کے پیکر تھے۔ جب بھی انہیں پکارا گیا جان سہیلی پر رکھ کر میدان میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم بھی اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کریں اور تمنا یہ رکھیں کہ اس راہ میں جان تک قربان کر دیں گے، جیسے حضورؐ نے فرمایا: لَوِدِدْتُ اَنْیْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیَا، یعنی میری بڑی خواہش اور آرزو ہے کہ میں اللہ

شَعْرُ أُقْتِلَ، شَعْرُ أَحْيَا، شَعْرُ أُقْتِلَ یعنی میری بڑی خواہش اور آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں پھر مجھے زندہ کیا جائے پھر قتل کیا جائے پھر زندہ کیا جائے اور پھر قتل کیا جائے۔ تو اللہ کرے کہ یہ خواہش ہمارے دلوں میں بھی آجائے۔ لیکن ہم خواہش کے ساتھ ساتھ کچھ اوصاف اپنے اندر پیدا کرنا ہوں گے۔ وہ اوصاف کیا ہیں:

التائبون۔ العابدون۔ الحامدون۔ السائحون۔ الراکعون۔ الساجدون۔
الأمرون بالمعروف۔ والنہون عن المنکر۔ والحافظون لحدود اللہ۔ یعنی
(۱) توبہ کرنے والے، رجوع کرنے والے۔ خطایا غلطی ہو جاتے تو فوراً توبہ کریں۔ (۲) اللہ کے عبادت گزار۔ اس کے اطاعت شعار، اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا اصول بنا لینے والے۔
(۳) اللہ کی حمد و ثنائیں مصروف رہنے والے۔ (۴) لذات و نیوی سے کنارہ کشی کر لینے والے۔
(۵) اللہ کی جناب میں رکوع کرنے والے۔ (۶) اللہ کی بارگاہ میں سجدے کرنے والے۔ (۷) نیکی کا حکم دینے والے (۸) اور بدی سے روکنے والے۔ (۹) اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور آخر میں فرمایا گیا کہ اے نبی، ایسے اہل ایمان کو بشارت دے دیجئے جنہوں نے اپنی جانیں اور مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے اور اس کے بعد ان کی زندگی کے شب و روز کا نقشہ اوپر بیان کردہ آیت کے مطابق ہے۔ انہیں ان کی کامیابی کی خوشخبری سنا دیجئے!!

یہ مقام اس اعتبار سے ذرۃٴ سام ہے کہ یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی اگلا قدم بیان کر دیا گیا: الْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ۔ حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔ اور موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کے لیے 'اقدام' کا مرعہ یہی ہوگا۔ سنت نبوی، سیرت نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہیں انقلاب کے چھ مراحل ملتے ہیں — (۱) دعوت (۲) تنظیم

(۳) تربیت (۴) صبر محض (PASSIVE RESISTANCE) (۵) اقدام (ACTIVE RESISTANCE)

اور (۶) مسلح تصادم۔ موجودہ حالات میں "مسلح تصادم" کے بجائے "اقدام" کا طریقہ ہوگا کہ انقلاب کے کارکن میدان میں مکمل کھڑے ہوں کہ ہم اللہ کی حدود کو توڑنے نہیں دیں گے۔ یہی نہی عن المنکر

بالید کا ایک انداز ہے۔ وہ طاقت کے ساتھ چیلنج کر دیں اور منکرات کے مقابلے میں دیوار بن کر

کھڑے ہو جائیں کہ اب ہم جیتے جی یہ نہیں ہونے دیں گے! اب یہ ہماری لاشوں پر ہی ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی فوج جس پر آپ کے بحیثیت کا بہت بڑا حصہ صرف ہوتا ہے، اس کا قصد کیا ہے۔ یہ کہ وطن عزیز کی سرحدوں کے محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں۔ جان دے دیں لیکن اس سرزمین کا ایک اپنچ بھی دشمن کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ ابھی تقریباً بیس کروڑ روپیہ

”ضرب مومن“ پر اسی لیے تو خرچ ہوا ہے کہ ہماری افواج چاق و چوبند رہیں اور ہر طرح کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہوں، کہیں وقت آنے پر سست پڑے ہوتے نہ

ہوں۔ یہ سب کس لیے ہے؟ حدودِ داخلی کی حفاظت کے لیے، وطن کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے لیے! لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ اس ملک کی نظریاتی حدود بھی ہیں۔ وہ نظریاتی حدود ”حدود اللہ“ ہیں، جن کی ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ قرآن مجیم میں آیا ہے: تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

فَلَا تَقْرُبُوهَا۔۔۔۔۔ ”دیکھو، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان کے قریب بھی نہ چسکنا، کہیں یوں فرمایا گیا:۔۔۔۔۔ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔۔۔۔۔ یہ اللہ کی حدود ہیں، انہیں پامال نہ کرو، ان سے

تجاوز نہ کرو!۔ اب اللہ کا وہ سرفروش بندہ جو جان اور مال اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہو اس کے اوصاف کی چوٹی درحقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی حدود کا محافظ بن کر کھڑا ہو جائے کہ میرے جیتے

جی اللہ کی یہ حد پامال نہیں کی جائے گی۔ میں زندہ رہوں اور اللہ کی حدود پامال کر دی جائیں، یہ نہیں ہوگا! اس موقع پر مجھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یاد آ گئے ہیں۔ انہوں نے یہی

فرمایا تھا: اَيْبَدُ الدِّیْنِ وَ اَنَا حَیٌّ؟ ”کیا دین کے اندر تغیر کر دیا جائے گا، جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟“ آپ کے دورِ خلافت میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا

اور کچھ حضرات نے مشورہ دیا تھا کہ آپ یہ اتنے سارے محاذ ایک دم نہ کھول لیجئے۔ ایک طرف مدعیانِ تبت ہیں۔ وہ تو کھلم کھلا مرتد ہیں۔ ٹھیک ہے ان کے خلاف تو اقدام کیجئے لیکن یہ

مناہعینِ زکوٰۃ تو کلمہ گو ہیں، انہوں نے کسی نئے نبی کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے، آپ ان کے خلاف محاذ نہ کھولیے، اس لیے کہ اس وقت حالات بڑے مخدوش ہیں۔۔۔۔۔ تو حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے: اَيْبَدُ الدِّیْنِ وَ اَنَا حَیٌّ؟ ”کیا دین کے اندر تبدیلی کر دی

جائے گی اس حال میں کہ میں زندہ ہوں؟ آپ افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق یونہی تو نہیں بن گئے تھے۔ یہ رتبہ بلند یونہی تو نہیں مل گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اس وقت حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ ایک طرف حبش اسامہ کو بھی نہیں روک رہے۔ سلطنتِ روم کے ساتھ بھگواؤ اس دلیل پر جاری رکھ رہے ہیں کہ حضورؐ نے جو جھنڈا باندھ دیا تھا میں اسے کیسے کھول دوں، حضورؐ نے جو لشکر تیار کر دیا تھا اب اسے کیسے روک دیا جائے! اگر یہ تمام محاذِ بیک وقت کھول دیئے گئے تو یہاں بدینہ منورہ میں محافظ کون ہوں گے؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا کہ اگر کوئی محافظ نہ ہو اور درندے آکر ابوبکر کو نوچیں تب بھی یہ کام ہو کر رہے گا۔ اہل لیے کہ میں اللہ کے رسولؐ کا خلیفہ ہوں۔ میرا مقصدِ زندگی ان کے دشمن کی تکمیل ہے۔ یہ ہے حفاظتِ حدودِ اللہ! تو یہ جو یہاں نو اوصاف بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے ایک ایک وصف اپنے اندر جذب کرنے کی توفیق عطا فرما! میری اس گفتگو میں اگرچہ کسی دوسرے مضامین بھی ضمنی طور پر آگئے، لیکن اس سے میرا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ناقابلِ تقسیم (INSEPERABLE) ہیں۔ قرآن مجید اگر نو مقامات پر انہیں متوازن (BALANCED) طریقے سے اجزائے لاینفک کی حیثیت سے بیان کر رہا ہے تو ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی ایک کو غیر ضروری یا اضافی قرار دے۔ اس سلسلے میں غلط فہمی رفع ہونی چاہیے یہ مغالطہ جنہیں بھی ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس مغالطے پر متنبہ اور مطلع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

پس نوشت

‘امر بالمعروف‘ اور نہی عن المنکر کے باہمی لزوم کے ضمن میں قرآن حکیم کے متذکرہ بالا نو مقامات کے علاوہ ”تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ“ کے مصداق و مساوی مقام سورۃ آل عمران کی آیات ۱۱۳، ۱۱۴ میں اہل کتاب کے صالح لوگوں کے اوصاف کے سلسلے میں وارد ہوا ہے: ”لَيْسُوا سَوَاءً طَمِنَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَمَّهُ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ“

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

اور
علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام

اب تک میں نے دو باتیں عرض کی ہیں — ایک یہ کہ امت مسلمہ کی غرض تائیس کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات دو ہیں: شہادت علی الناس اور ائمر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اور دوسری یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم و ملزوم ہیں یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اب ہم تیسری بحث کی طرف آتے ہیں کہ ان دونوں میں اہم تر وہی عن المنکر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعدد اضافی مقامات ایسے ہیں جہاں صرف نہی عن المنکر کا بیان ہے۔ ہمارے اصول فقہ میں بھی یہ اصول ہے کہ 'نہی' نسبت 'امر' کے زیادہ زور دار اور مؤثر ہے۔ مثال کے طور پر دو حدیثوں کو لیجئے۔ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے جب بھی کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت 'تہیجۃ المسجد' ادا کر لے۔ دوسری حدیث میں یہ ہے کہ عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک کوئی نماز نہیں پڑھے۔ اب اگر کوئی شخص عصر کے بعد مسجد میں آئے تو وہ کیا کرے؟ ہمارے فقہاء اس مسئلے میں نہی کو امر کی نسبت مقدم سمجھتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عصر کے بعد غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں آتا ہے تو وہ تہیجۃ المسجد ادا نہیں کرے گا۔

قرآن و حدیث کی رو سے خاص طور پر علماء اور صوفیاء کے کرنے کا اصل کام یہی نہی عن المنکر ہے اور عذاب الہی سے نجات کی واحد راہ بھی یہی ہے۔ اس کے ضمن میں ہم قرآن حکیم کی چند آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین احادیث کا مطالعہ کریں گے۔

لَا إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ

(متفق علیہ: عن ابی قتادہ)

لَا صَلَوةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ (متفق علیہ: عن ابی سعید الخدری)

قرآن حکیم میں اہل کتاب کے جو حالات وارد ہوئے ہیں اُن کی حیثیت و تحقیق ایک آئینہ کی سی ہے جو مسلمانوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ میری تقاریر اور مضامین میں بنی اسرائیل کے بارے میں بارہا اس حدیث کا حوالہ آیا ہے کہ حضورؐ نے خبر دی تھی کہ میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جو تادوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ میری امت میں بھی وہ ساری خرابیاں پیدا ہوں گی جو اُن میں پیدا ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ اگر اُن میں کوئی بد بخت ایسا اٹھا تھا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا ہو تو میری امت میں سب سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا پیدا ہو گا جو یہ حرکت شیع کرے گا۔ اسی کے حوالے سے قرآن حکیم نے بنی اسرائیل پر جو تنقید کی ہے اس کو پڑھیے۔

علماء یہود پر قرآن کی تنقید

سورۃ المائدہ کی آیات ۶۲-۶۳ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے آیا ہے :

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَآكُلِهِمُ الشَّحْتَ ۖ لِبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝
لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبُّزِيُتُونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمْ
الْإِثْمَ وَآكُلِهِمُ الشَّحْتَ ۖ لِبِئْسَ مَا كَانُوا
يَصْنَعُونَ ۝

”اور تم دیکھو گے ان میں سے ایک کثیر تعداد کو کہ تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے آگے بھٹنے کی کوشش کرتے ہیں گناہ کے کاموں میں اور ظلم و زیادتی میں اور حرام خوری میں بہت بڑے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے ریش

لَيَأْتِيَنَّ عَلَىٰ أُمَّتِي مَا أَتَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ ۖ حَدَّوَالنَّعْلَ بِالنَّعْلِ ۚ حَتَّىٰ
إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ آتَىٰ أُمَّتَهُ عِلَآئِيَةً لِّيَكُونَنَّ فِي أُمَّتِي مَنْ
يَصْنَعُ ذَٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما)

اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے بہت ہی بُرے عمل میں جو وہ کر رہے ہیں۔
 یعنی اگرچہ کہنے کو یہ لوگ اللہ کے نام لیوا ہیں، موسیٰ کے امتی ہیں، تورات کے ماننے والے ہیں، سینکڑوں نبیوں پر ایمان کے دعویدار ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ لیکن علماء ان کا حال یہ ہے کہ بجائے نیکیوں میں پیش قدمی کرنے کے، تین بُرے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (۱) الاثم: گناہ کا کام، فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب، حق تلفی اور لوگوں کے حقوق کو غضب کرنے اور سلب کرنے کا کام۔ (۲) والعُدوان: اور ظلم و زیادتی، تعدی (۳) وَاكْثَلَهُمُ الشُّحْتُ: اور ان کی حرام خوری۔ اس حرام خوری کے مختلف انداز تھے۔ سود بھی تھا، عواید بھی تھا۔ اور یہی دوڑ آپ کو اپنے ہاں بھی نظر آجائے گی۔ آپ کے اس ملک میں جتنے بڑے پیمانے پر جو گزشتہ دنوں ہوا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سیورر فیض کی شکل میں کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا بچا کھیلایا گیا۔ اور آپ کی وزیر اعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں تو وزیر خزانہ سے کہنے والی ہوں کہ باقی ٹیکس وغیرہ سب کو چھوڑیں اور یہ لاٹری کا دھندا شروع کریں۔ اس میں جو رقم اکٹھی ہوتی ہے وہ ہم نے کسی اور کام میں نہیں دیکھی۔ انعامات کی امید پر جو لاکھوں افراد جوئے کے ترنگ ہوئے ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ یہ آسمان سے اترنے والی کوئی دوسری مخلوق نہیں تھی۔ یہ کوئی ہندو نہیں تھے، یہودی نہیں تھے، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا تھے۔

آگے فرمایا: لَوْلَا يَتَّبِعُهُمُ الرَّاٰيِيُوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمُ وَاكْثَلَهُمُ الشُّحْتُ۔ ”کیونکہ انہیں ان کے صوفیاء اور ان کے علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے۔“ ربّانی کہتے ہیں اللہ والے کو، ”ربّ“ سے ربّانی بنا ہے یعنی درویش، فقراء، صوفیاء اور صلحاء وغیرہ۔ احبار جمع ہے ”حبر“ کی جبر کہتے ہیں بہت بڑے عالم کو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ”جبر الامر“ کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دعا فرمائی تھی کہ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُمْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُمُ التَّوَاتُلَ یعنی اے اللہ اسے دین کا تفقہ عطا فرما اور قرآن حکیم کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرما۔ حضور کی دعا کی برکت سے امت کے سب سے بڑے عالم ہو گئے تو ظاہر

بات ہے کہ جس طرح ہماری امت میں بڑے بڑے عالم اور صوفیاء ہیں، ایسے ہی بنی اسرائیل میں بڑے بڑے عالم اور فقیہ بھی ہوتے تھے اور صوفیاء اور درویش بھی۔ تو فرمایا کہ ان کے کرنے کا کام تو یہ تھا کہ وہ لوگوں کو گناہ کی بات کہنے اور حرام غوری سے روکتے، لیکن فی الحقیقت وہ کیا کام کر رہے ہیں؟ انہوں نے اپنے فرض منصبی کو ترک کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو بُرائی سے روکتے نہیں۔ اور روکیں بھی کیسے؟ حرام غوری سے روکیں گے تو لوگ ان کی طرف رجوع نہیں کریں گے، کسی دوسرے کی طرف کر لیں گے۔ میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ میں آئندہ آپ کے ہاں جمعہ پڑھنے نہیں آؤں گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے کہ آپ ہمیں ہر چند جمعوں کے بعد وہ سُود کی شاعت والی حدیث سنا دیتے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ سُود کے بغیر تو ہمارا کاروبار چلتا نہیں۔ اب ایسی حدیثیں سننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم لوگ وہ کام کر رہے ہیں جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے ساتھ بدکاری سے بھی ستر گنا بڑا گناہ بتایا ہے۔ آپ ہمیں ایسی حدیثیں سناتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میرا کام تو سنانا ہے، پہچانا ہے، سمجھانا ہے۔ سنانا چاہو تو سنو! آج نہیں تو شاید اللہ تعالیٰ اکل توفیق عطا فرمادیں لیکن اگر سنانا نہیں چاہتے تو میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ اب وہ علماء جن کی مجبوری یہ ہے کہ اُن کا معاش کا معاملہ وہیں سے ہے، جن کی تنخواہیں انہی سُود خور سرمایہ داروں کی طرف سے آرہی ہیں وہ انہیں کیسے کہیں کہ حرام غوری ترک کر دو۔ اکثر و بیشتر تو یہی اور سرمایہ دار مساجد کے منتظم اور مہتمم ہیں۔ وہی تو ہیں جو یہاں بہترین قائلین لا کر بچھاتے ہیں۔ اب اُن کے کاروبار میں حرام ہے تو انہیں کون روکے! الاشارة اللہ۔ اس معاشرے میں کچھ سعید و صلیں بھی ہیں جن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک قلیل تعداد امین اور دیاندار تاجروں اور کاروباری حضرات کی بھی یقیناً موجود ہے اور معدودے چند علماء بھی ایسے ہیں جو کسی ملامت کے خوف کے بغیر نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دیتے ہیں لیکن

لے الرِّبَا سَبْعُونَ جُزْءً أَيْسَرُهَا أَنْ يَشْكَحَ الرَّجُلُ أُمَّةً

(رواہ ابن ماجہ و ابیہقی فی شعب الایمان: عن ابی ہریرہ)

معاشرے میں ایسے لوگوں کا وجود آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ جب معاشرے سے
نہی عن المنکر ختم ہو جاتا ہے تو پھر تباہی و بربادی عام ہو جاتی ہے۔ آج اس مضمون کو اچھی طرح سمجھئے
قرآن کہتا ہے کہ ”کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے صوفیاء اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام
خوری سے؟“ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ: ”بہت برا ہے وہ عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا“

سورۃ المائدہ میں آگے چل کر اسی کے ہم مضمون چار آیات مزید آئی ہیں:
لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَى لِسَانِ
دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا
يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ تَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ
أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ۝
وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا
اتَّخَذُوا هُمُ أَوْلِيَاءَ ۚ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ۝

”بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان پر حضرت داؤد اور حضرت
عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی
کرتے تھے اور (حدودِ الہی سے) تجاوز کرتے تھے۔ (اور ان کا اہل جہنم یہ تھا کہ) وہ
ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے ان برائیوں سے جو وہ کرتے
تھے۔ بہت ہی بُرے طریقے پر عمل ہے جس پر وہ کاربند تھے۔ تم دیکھو گے ان میں سے بہت
سوں کو کہ دوستی رکھتے ہیں کافروں سے۔ کیا ہی بُرا سامان انہوں نے اپنے لیے آگے
بھجیا ہے کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔
اور اگر وہ (واقعہ) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اس شے پر جو اس پر نازل کی
گئی تو وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بناتے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر
نافرمان ہیں۔“

یہاں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو اگرچہ بنی اسرائیل میں سے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے امتی تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لاڈلے اور چہیتے ہونے کا دعویٰ بھی تھا، لیکن اُن کی روش گناہ و معصیت اور حرام خوری کی تھی۔ چنانچہ ان پر انبیاء کی زبان سے لعنت فرمائی گئی۔ حضرت داؤد کی زبانی ان پر کیا کیا لعنتیں ہوئیں، ان کے الفاظ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اُن وقت جو بھی ’زبور‘ موجود ہے جسے ’PSALMS‘ کہا جاتا ہے اور جو عہد نامہ قدیم (OLD TESTAMENT) کا حصہ ہے اس میں ایسی باتیں موجود نہیں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر حضرت داؤد کی زبان سے جو تنقید کی باتیں کہلائی تھیں، انہیں یہود نے زبور کے صفحات سے کھرچ دیا ہے۔ لیکن اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ایسی باتیں اناجیل میں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے خاص طور پر علمائے یہود پر بہت تنقیدیں کی ہیں۔ انہیں سانپ کے سپنولیوں سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا: ”تم سانپ کے سپنولیوں کے مانند ہو۔ تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے اپنے اوپر تقویٰ کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور اندر سے تمہارا کردار انتہائی گھناؤنا ہے۔“ علمائے یہود کو مخاطب کر کے حضرت مسیحؑ نے یہ الفاظ بھی فرمائے: ”تمہارا حال اُن قبروں کے مشابہ ہے جنہیں اوپر سے توسفیدی کی گئی ہے اور بڑی خوشمانظر آ رہی ہیں لیکن اُن کے اندر گلی سٹری ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔“ اور یہ بہترین ضرب اثل بھی حضرت مسیحؑ ہی کی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر ادب میں استعمال ہوتی ہے کہ ”تم پتھر چھپانتے ہو اور سونپے اونٹ نکل جاتے ہو۔“ ہمارا حال بھی یہی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں لیکن بڑے بڑے گناہوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں۔ سود خوری پر کوئی نہیں روکے گا لیکن رفع یدین، آمین بالجہر اور تراویح کی تعداد پر بڑے بڑے پوسٹر بھی چھپیں گے، بڑے چلیج بھی ہوں گے، لمبی چوڑی بخشش اور مناظرے بھی ہوں گے اور پورے پورے کانفرنس بھی ہوں گی۔ حالانکہ دین میں ان کی اہمیت بالکل جزوی اور ثانوی ہے۔ دوسری طرف سود کا لین دین ہو رہا ہے، جو اسٹریٹ سب کچھ چل رہا ہے، لیکن کسی کو کچھ کہنے کی توفیق نہیں۔ اصل میں یہی وہ بات ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل پر لعنت کی گئی۔ آگے فرمایا:

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاكَافُوا يَعْتَدُونَ۔ ”یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور حدودِ الہی سے تجاوز کی روش اختیار کی۔“ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر رحمت فرماتا ہے

تو وہ بھی اس کے اعمال کی مناسبت سے، اور اگر اللہ کی طرف سے لعنت ہوتی ہے تو وہ بھی یونہی نہیں ہو جاتی، بلکہ لوگوں کی اپنی بدکاری اور بد اعمالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اب آگے وہ اصل مضمون آ رہا ہے جس کے لیے میں یہ آیات بیان کر رہا ہوں، کَاذِبًا لَا يَتَّكَا هَوْنًا عَنْ مَكْرٍ فَعَلُوهُ۔ ان کا سب سے بڑا جرم، سب سے بڑی نافرمانی، اور سب سے بڑا اعتداریہ ہے کہ جو غلط کام وہ کرتے تھے، اس پر ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے، روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ 'تناہی' باب تفاعل سے ہے۔ اسی باب سے لفظ 'تواہی' ہے، وَتَوَكَّأَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَكَّأَوْا بِالصَّبْرِ۔ شدت و اشتراک باب تفاعل کا خاصہ ہے یعنی باہم کسی کام کو انتہائی شدت و مد کے ساتھ سرانجام دینا۔ تو 'تناہی' کے معنی ہوں گے پوری تاکید اور شدت کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے کو گناہوں سے روکنا ٹوٹنا۔ قرآن یہود پر فوجی جرم عائد کر رہا ہے کہ ان کا اصل جرم جس کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی وہ یہی تھا کہ وہ مشکرات سے ایک دوسرے کو پوری تاکید کے ساتھ روکتے نہیں تھے۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے کے مختلف طبقات کے اندر مختلف خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کی برائیوں پر روک ٹوک اس لیے بند کر دیتے ہیں کہ اس طرح خود ان کی اپنی برائیوں پر بھی تنقید ہوگی۔ لہذا ان کے مابین گویا ایک شرفیاء نہ معاہدہ (A GENTLEMAN AGREEMENT) ہو جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ نہ کہے۔ آج کل کے دور میں تو بسا اوقات اس کو رواداری کا نام بھی دیا جاتا ہے کہ ہر ایک کا اپنا اپنا خیال، اپنا اپنا نظریہ، اپنے اپنے معیارات اور اپنی اپنی اقدار ہیں لہذا کسی کو دوسرے پر تنقید کا حق نہیں۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس مضمون سے متعلق ہم ایک حدیث کا مطالعہ بھی کر لیں تاکہ قرآن مجید کی تفسیر حدیث رسول کی روشنی میں سامنے آجائے۔ حدیث چونکہ طویل ہے لہذا اس کا ترجمہ و تفہیم ہم متن کے ساتھ ساتھ کریں گے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ أَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّفْسُ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ -

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا۔

دیکھیے کسی قوم میں جب زوال آتا ہے تو درجہ بدرجہ آتا ہے۔ کوئی آدمی نیچے پر چڑھتا
ہے تو ایک ایک سیڑھی کر کے چڑھتا ہے اور نیچے اترتا ہے تب بھی درجہ بدرجہ اترتا ہے۔ اسی
طرح گراؤ بھی ایک دم سے نہیں آتی۔ بڑے بڑے بند جب ٹوٹتے ہیں تو شروع میں چھوٹا
سا سوراخ ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بڑی بڑی نہروں میں شکاف ایسے پڑتے ہیں کہ بااقتنا
کسی چوہے کے پل کے ذریعے سے پانی آتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک بڑا شکاف پڑ جاتا
ہے۔ تو وہ چوہے کا پل کون سا ہے جو قوموں کو برباد کرتا ہے؟ اس کا ذکر فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے کہ بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا:

أَنَّهُ كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَّجُلَ فَيَقُولُ

کہ ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرتا تھا تو یہ کہتا تھا۔

يَا هَذَا اتَّقِ اللَّهَ وَدَعْ مَا تَصْنَعُ فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَكَ

اے فلاں، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جو تم کر رہے ہو اس کو چھوڑ دو، اس لیے کہ یہ تمہارے

لیے جائز نہیں ہے۔

کہ بھائی یہ کاروبار جو تم کر رہے ہو یہ مسود پر مبنی ہے، اسے چھوڑ دو۔ یہ تمہارا طرز معاشرت اللہ کے
احکام کے مطابق نہیں ہے، اسے تبدیل کرو۔ مثلاً آج ہم کسی سے یہ کہیں گے کہ سیور رفل کی
طرح کی سکیموں میں روپیہ مت لگاؤ، یہ جوا ہے، جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ یہ جو بے پردگی
اختیار کی ہے اس کو چھوڑ دو، یہ چیزیں جائز نہیں ہیں، حلال نہیں ہیں۔ یہاں تک تو
بات اس نے صحیح کی، بُرائی کے اوپر زور کٹوک کی، نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن

ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلَىٰ حَالِهِ

پھر اس کی اسی شخص سے اگلے روز دوبارہ ملاقات ہوتی تھی اور وہ اپنے سابق حال پر

قائم ہوتا تھا۔

یعنی جس بُرائی میں وہ مبتلا تھا، اس کو اس نے ترک نہیں کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ حالت پر قائم رہا۔ وہ حرام خوری سے باز نہیں آیا، اپنا سودی کاروبار بند نہیں کیا، جو اکیلے سے تو نہیں کی، بلکہ حرام کاموں میں اسی طرح ملوث رہا۔

فَلَا يَمْنَعُهُ ذَلِكَ أَنْ يَكُونَ أَكِيلَهُ وَتَسْرِيْبَهُ وَقَعِيدَهُ

لیکن یہ چیز مانع نہیں ہوتی تھی اُس (پہلے شخص) کے راستے میں کہ وہ اس کا ہم نوالہ وہم پالہ اور ہم نشین بنے۔

یعنی اس کے باز نہ آنے کے باوجود وہ صبح (اسے بدی سے روکنے والا) اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا بھی تھا، پیتا بھی تھا، اس کا ہم نشین بنتا تھا، اس کے ساتھ خوش گپیاں کرتا تھا۔ اس کا مقاطعہ اور باتیکاٹ نہیں کرتا تھا۔ دیکھئے، نماز و تر میں آپ روزانہ دعائے قنوت میں یہ الفاظ کہتے ہیں: وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُوكَ۔ اے اللہ جو شخص بھی تیرا فاجر ہوگا، تیرے احکام کو توڑنے والا ہوگا، ہم اس سے لا تعلق کر لیں گے، اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں گے۔ لیکن عملاً ہمارا حال کیا ہے، اس پر خود غور کر لیجئے! کیا آج ہمارا طرز عمل بھی وہی نہیں ہے جو بنی اسرائیل کے مصلحین کا تھا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن جیسے انجام سے محفوظ رکھے۔

فَلَمَّا فَعَلُوا ذَلِكَ ضَرَبَ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ۔

جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو آپس میں مشابہہ کر دیا۔

کہ جب یہ روش عام ہو گئی اور غیرت و حمیت دینی ختم ہوتی گئی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی باہم ایک جیسا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ خبر روزے کو دیکھ کر خبر روزہ رنگ پکڑتا ہے جب تک کہ ایسے لوگوں کا مقاطعہ اور سوشل باتیکاٹ نہ ہو ان کے رنگ سے آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔ ان کا وہ رنگ آپ پر چڑھ جاتے گا اور آپ کے دل کے اوپر بھی وہی اثرات طاری ہو جائیں گے۔

اس کے بعد حضورؐ نے سورۃ المائدہ کی یہی چار آیات تلاوت فرمائیں جو ہمارے زیر مطالعہ ہیں یعنی:

لَعَنَ الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَسْقُون

یہ گویا کہ ان چار آیات کی مستند شرح ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے سامنے بیان فرمائی کہ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلے پہل جو نقص واقع ہوا وہ یہ تھا کہ لوگوں میں احساس تھا، ان کے علماء و نکرات سے روکتے تھے کہ خدا کے لیے بُرائی سے باز آ جاؤ، لیکن ان کے باز نہ آنے پر ان سے قطع تعلق نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ بنے رہتے تھے اور ان کے ساتھ مجلسی روالہ بطریق قائم رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ توبہ لے نہیں، خودیہ ناحیین اور مصلحین بدل گئے، ان کے اپنے دلوں کی کیفیت تبدیل ہو گئی اور ان کے اوپر بھی وہی فاسقانہ رنگ چڑھ گیا۔

شہر قال:

(ان آیات کی تلاوت کے بعد) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كَلَّا وَاللَّهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

ہرگز نہیں، خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا۔

وَلَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا۔

وَلَتَأْخُذْنَ عَلٰی يَدِ الظَّالِمِ

اور تمہیں لازماً ظالم کے ہاتھ کو قوت کے ساتھ پکڑ لینا ہوگا۔

وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا

اور تمہیں اس کو لازماً حق کی طرف جبراً موڑنا ہوگا۔

لے بقول علامہ اقبالؒ

ہوتی نہ زارغ میں پیدا بلند پروازی / فراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زارغ

وَلْتَقْصُرْنَ لَهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا

اور اسے حق کے اوپر قائم رکھنا ہوگا۔

اللہ اللہ —، کلام نبوت کی فصاحت و بلاغت ملاحظہ فرمائیے اور پھر یہ انتہائی تاکیدیں انداز بھی ہے۔ آگے فرمایا:

أَوْ لِيُضْرِبَنَّ اللَّهُ بِقُلُوبٍ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ

یا پھر اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مشابہ کر دے گا۔

یعنی اگر تم بھی وہی طرز عمل اختیار کرو گے اور اس ضمن میں اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرو گے تو اللہ تمہارے دلوں کو بھی آپس میں ایک جیسے کر دے گا۔ انہی لوگوں جیسی قلبی کیفیات، وہی بے حسی، وہی بے غیرتی تمہارے اندر بھی پیدا ہو جائے گی۔

ثُمَّ لِيَعْلَنَ كُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ

پھر اللہ تعالیٰ تم پر بھی لعنت فرمائے گا جیسے ان (یہود) پر لعنت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس آخری انجام سے بچائے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔

دَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ

اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام ترمذی دونوں نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

هَذَا الْفُظُّ لِي دَاوُدَ ، وَلَفْظُ التِّرْمِذِيِّ :

متذکرہ بالا الفاظ روایت ابو داؤد کے ہیں اور ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں (جو

آگے آرہے ہیں) :

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فرمایا :

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ فِي الْمَعَاصِي

جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے

ثُمَّ هُمْ عَلَمَاءُ وَهُمْ

تو ان کے علماء نے انہیں روکا۔ (یعنی ابتداء میں ان کے علماء نہیں عن الشکر کا فرضیہ
سراخام دیتے رہے)۔

فَلَمْ يَنْتَهُوا

لیکن وہ باز نہ آئے۔

فَجَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَوَاكُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ

(لیکن اس کے باوجود ان علماء نے ان کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ باہم کھانا پینا جاری رکھا۔

فَضْرَبَ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ

تو (اس کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔

وَلَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ

اور ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی۔

ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ

یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے رہے۔

فَجَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَكِمًا وَقَالَ:

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے، جبکہ اس سے پہلے آپ ٹیک

لگائے ہوئے تھے۔ اور فرمایا:

لَا، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ

ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔

حَتَّى تَأْطِرُوهُمْ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا

(تمہاری ذمہ داری اس وقت تک ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ تم انہیں زبردستی حق

کی طرف موڑ نہ دو!

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی روش سے

ہمارے علماء و صلحاء کا اور ان صوفیاء کا جو لوگوں کو تزکیۂ نفس کے طریقے اور تقرب الی اللہ کے

راستے بتا رہے ہیں، سب سے بڑا فرض یہی نہیں عن الشکر ہے۔ ان سب پر واجب ہے کہ وہ

لوگوں کو منکرات پر ٹوکیں، انہیں منع کریں، ان پر تنقید کریں — اور اگر باز نہ آئیں تو ان کے ساتھ مقاطعہ کریں، ملنا جلنا چھوڑیں، ان پر یہ سوشل پریشر ڈالیں۔ اس وقت اگرچہ اہل حق علماء بھی موجود ہیں، دنیا کبھی ان سے خالی نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہوگی — اس کی ضمانت دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لَا يَزَالُ فِيْ اُمَّتِيْ حُلَافَةٌ قَائِمِيْنَ عَلَي الْحَقِّ (میرمی امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا) — لیکن اس وقت ان کی اکثریت کا حال کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر بیچارے ملازم ہیں۔ انہی لوگوں کی طرف سے آنے والی تنخواہوں پر ان علماء و خطباء کی معیشت کا دار و مدار ہے۔ انہی کی طرف سے موصول ہونے والے ہدیوں اور نذرانوں سے ان کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ لہذا یہ انہیں روکیں اور ٹوکیں تو کس طرح؟ اَلَا مَا شَاءَ اللہ!

دینی جماعتیں اور پاور پالیٹکس!

ان سے آگے بڑھ کر میں فعال دینی جماعتوں کے بارے میں عرض کر رہا ہوں کہ پاور پالیٹکس میں ان کے موٹ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی ساری دوستیاں اور تعلقات انہی لوگوں کے ساتھ ہیں جو کھلم کھلا منکرات میں مبتلا ہیں یہ انہی کے ولیموں میں شریک نظر آئیں گے اور اخبارات میں فوٹو چھپیں گے کہ فلاں حضرت بھی میٹھے ہوئے ہیں فلاں جماعت کے لیڈر بھی تشریف فرما ہیں، فلاں کے آدمی بھی آئے ہوئے ہیں — اور اس طرح کے ولیموں میں جو کچھ منکرات ہوتی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان لوگوں کا جو روتیہ ہے، جو کردار ہے اور ہماری پوری اجتماعی زندگی کے اندر جو زہرہ گھول رہے ہیں اس سب سے صرف نفاکر کے صرف وقتی سیاست کے پیش نظر کسی وقت کسی کی ٹانگ کھینٹنے کی خاطر ان کے ساتھ اتحاد ہو جائے گا اور کوئی تفریق نہیں ہوگی کہ اس کا نظریہ کیا ہے، اس کا رہن سہن کیا ہے، اس کا ذریعہ معاش کیا ہے، اس کے ہاں پردہ ہے یا بے پردگی ہے، کوئی پروا نہیں! حدیث کے الفاظ ”وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ“ کے مصداق انہی کی ہم جلسی، انہی کے ساتھ کھانا پینا، سماجی تقریبات میں ان کے ساتھ شرکت اور سیاسی اتحادوں میں ان کے ساتھ جمع ہو جانا یہ

ساری روش اس مطلوب طرز عمل کی بالکل ضد ہے۔ اگر ہم اپنی روش تبدیل نہیں کرینگے تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب ہم اللہ کی لعنت کے مستحق ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ لازماً تم پر بھی لعنت کرے گا جیسے اس نے لعنت فرمائی تھی بنی اسرائیل پر۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہو تو بنی اسرائیل کو بھی بڑا فخر تھا کہ ہم ابراہیم کی نسل سے ہیں، ہم موسیٰ کے امتی ہیں، ہم تورات کے ماننے والے ہیں، نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَ اَحِبَّاءُہٗ، کہ ہم تو اللہ کے بیٹوں کے مانند ہیں اس کے بڑے لاڈلے اور چیمپے ہیں۔ لیکن ان کا یہ چہیتا اور لاڈلا ہونے کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے عدل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنا۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: صُرِّبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمُسْكَنَةُ وَ بَاءَ وَ يُغَضِّبُ مِنَ اللّٰهِ۔ (ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور محتاجی اور وہ پھر اللہ کا غصہ لے کر)۔

اگلی آیات میں ان کے مجلسی روابط کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

تم دیکھو گے ان میں سے بہت سوں کو کہ دوستی اختیار کرتے ہیں انہی کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی۔

انہی کے ساتھ مجلسی روابط ہیں، انہی سے دوستیاں استوار ہو رہی ہیں اور محبت کی بینکس بڑھاتی جا رہی ہیں۔ اس دور میں ہماری دینی جماعتوں کے اتحاد اور گٹھ جوڑ اُن لوگوں کے ساتھ ہو رہے ہیں جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بڑا لاکھ ہے ہیں کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے۔ یہ گویا کہ بہت بڑا اجتماعی جرم ہے کہ کسی کے عقائد و نظریات افعال کردار اور شخصیت و کردار کی تمیز کیے بغیر اس سے روابط بڑھالیے جائیں۔

لَيْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ

بہت بُری ہے وہ کمائی جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے۔

یعنی ان کے اس طرز عمل کے نتیجے میں اللہ کے ہاں ان کے لیے جو کچھ جمع ہو رہا ہے بہت بُرا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟

أَنْ سَخَطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ○

وہ یہ کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

بنی اسرائیل اپنے کرتوتوں کی بنا پر اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ ان کے لیے قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر ”وَبَاءٌ وَيُعْظِبُ مِنَ اللَّهِ“ کے الفاظ آتے ہیں اور یہاں انہیں ”خلود فی العذاب“ کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے عذاب تو خالص کفار کے لیے ہو گا اور جو کوئی متحور یا ایمان بھی رکھتا ہو اس کے لیے دائمی عذاب نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ سزا علمائے یہود کے لیے فرمائی جا رہی ہے۔ گویا ان کے طرز عمل سے درحقیقت ان کے ایمان کی نفی ہو رہی ہے۔

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ

اور اگر وہ (واقعہ) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اس شے پر جو اس پر نازل کی گئی۔

مَا اتَّخَذُوا هُمْ أَوْلِيَاءَ

وہ انہیں اپنا دوست نہ بناتے۔

جو سمجھتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں، اگر وہ واقعہ ایمان رکھتے ہوتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستیاں گانٹھتے اور ان سے مجلسی روابط استوار کرتے۔ ایمان کے اندر تو غیرت ہوتی ہے جو کسی درجے میں بھی ایسی بات برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔

وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ○

لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے۔

سورۃ المائدہ کے یہ دو مقامات اور البوداؤد اور ترمذی کی روایت کردہ یہ دو احادیث جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں، ان میں بلاشبہ ہمارے لیے ہدایت و رہنمائی کے خزانے مضمر ہیں۔ آپ انہیں خود بھی پڑھیے اور انہیں دوسروں تک بھی پہنچائیے، انہیں عام کیجیے! اور اللہ کرے کہ یہ آیات اور احادیث ان حضرات کے کانوں تک بھی پہنچ جائیں جو دین و مذہب کے نام لیوا ہیں اور وہ ان کی روشنی میں اپنے طرز عمل کے بارے میں کچھ غور کریں۔ ان دینی جماعتوں کی حالت دیکھ کر بالخصوص شدید صدمہ ہوتا ہے جو فی الوقت پاور پالیکس میں

دائیں یا بائیں بازو کی بڑی سیاسی جماعتوں کے ضمیمے بنی ہوئی ہیں، جبکہ انہیں معلوم بھی ہے کہ فریقین میں انیس بیس سے زیادہ کافرق نہیں ہے۔ وہی سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی۔ اور ان کے لچپن، ان کے طرز معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کی اقدار میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر زمیند کوں کی طرح پھد کتے رتے ہیں، یا آجکل کی اصطلاح میں ہارس ٹریڈنگ ہو رہی ہے۔ لیکن مذہبی جماعتیں ادھر یا ادھر نہتی ہو کر اور اپنی طاقت ان کے پڑوں میں ڈال کر خود اپنی منزل کھوئی کرتی ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام تو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، فرضیہ نہی عن المنکر کی ادائیگی ہے۔

ایک اچھی مثال

اس سلسلے میں گزشتہ دنوں کچھ اچھی خبریں آئی تھیں اور بعض حلقوں کی طرف سے نہی عن المنکر کے ضمن میں زوردار موقف اختیار کیا گیا۔ **كَتَرَاللّٰهُ امْتَالِهٖ** (اللہ کرے کہ ان کی مثالیں اور بڑھیں!) اور مجھے اس پر خوشی ہے کہ کم از کم جماعت اسلامی نے تو اس سلسلے میں ٹوٹ کر موقف اختیار کیا۔ اس اقدام کی جو برکتیں ظاہر ہو رہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ بھارتی طائفے کی آمد رک گئی ہے اور سال نو کے جشن کے عنوان سے بڑے بڑے ہوٹلوں میں طوفان بدتمیزی کے جو مظاہرے ہو کر تے تھے، وہ اب لوگوں کی اپنی کوٹھیوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور اس موقع پر بعض ایسی تنظیموں کی طرف سے بھی جماعت کا ساتھ دینے کا اعلان آگیا تھا جن کے نہ صرف افکار و نظریات ان سے مختلف ہیں، بلکہ اُس وقت ان کے مابین بنید کشیدگی بھی تھی۔ چنانچہ اس سے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ یہی راستہ دینی جماعتوں کو مجتمع کرنے کا راستہ ہے!!

بعض حضرات تبلیغی جماعت سے بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ لوگ تو سیاست کی بات بھی کرنے کو تیار نہیں، اور مسلمانوں پر اگر کہیں کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس پر بھی کوئی آواز اٹھانے کے روادار نہیں۔ یہ بات اگرچہ بنیادی طور پر غلط نہیں ہے، انہوں نے بطور پالیسی یہ روش اختیار کی ہے اور وہ نہی عن المنکر سے صرف نظر کر کے صرف امر بالمعروف کا کام کیے جا رہے ہیں۔

اور میں ابھی قرآن حکیم کے نو مقامات کے حوالے سے ان کی اس غلطی کو واضح بھی کر چکا ہوں۔ لیکن جو کام یہ کر رہے ہیں وہ بھی رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔ یہ خیر و شر اور حلال و حرام کا شعور تو پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین حاصل ہے کہ اس معاشرے میں اگر کوئی ایسی قوت پیدا ہو جائے جو نہی عن المنکر کو طاقت کے ساتھ کرنے کے لیے میدان میں آئے، تو تبلیغی جماعت کے ساتھ عوام کی جو طاقت ہے، ان کی بہت بڑی تعداد اس کام میں شریک ہو جائے گی۔ تحریک نظام مصطفیٰ میں بھی تو تبلیغی جماعت سے وابستہ بہت سے نوجوان میدان میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور میں آپ کو اسی تحریک کا وہ واقعہ یاد دلاتا ہوں جب لاہور کے نیلا گنبد چوک میں تبلیغی جماعت کا ایک نوجوان بار بار کی وارننگ کے باوجود سینہ تانے آگے بڑھتا رہا اور بالآخر سینے میں گولی کھا کر جام شہادت نوش کر گیا۔ ان واقعات میں انسان کے لیے عبرت کا وافر سامان پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس ملک میں ۱۹۸۲ء میں میرے حوالے سے بعض مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا، مجھے اُسی وقت اس حقیقت کا تجربہ ہو گیا تھا کہ اگر واقعہ کوئی جماعت نہی عن المنکر کا کام کرنے کے لیے کھڑی ہو جائے تو تمام مذہبی مکاتب فکر ساتھ دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اگرچہ علی طور پر انحطاط کا شکار ہے لیکن ہماری چودہ سو برس کی تاریخ نے ہمارا اجتماعی ذہن بنایا ہے اس کے تحت اشعار میں معروف اور منکر کے صحیح تصورات موجود ہیں۔ چنانچہ اُس موقع پر تمام مکاتب فکر کی مساجد سے میری تائید ہوئی، جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے میرے حق میں حیدر آباد سندھ میں تقریر کی، اور کراچی میں جماعت اسلامی کے حلقہ خواتین کی طرف سے مغرب زدہ خواتین کے جلوس کے جواب میں باپردہ خواتین کا کئی گنا بڑا جلوس نکالا گیا تو اُس وقت یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ عذرانہم ہو تو یہ مٹی بڑی زرغیر ہے ساقی! لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے ایک جماعت ایسی ہو جو منکرات کے خلاف میدانِ عمل میں آنے والوں کو کنٹرول میں رکھ سکے۔ یہ نہ ہو کہ کہیں ع ”دینِ مٹانی بسیل اللہ فساد“ کی صورت پیدا ہو جائے، جب تک یہ شکل نہ ہو جائے اس وقت تک میدان میں آنے کے مثبت نتائج نہیں نکل سکتے، بلکہ اس سے جو سیاسی بے چینی پیدا ہوگی اس سے کچھ اور لوگ فائدہ اٹھالے جائیں گے، جو ملحد و بے دین بھی ہو سکتے ہیں اور ملک و قوم کے دشمن بھی!!

دو مزید احادیث

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت کے ضمن میں مزید دو احادیث کا مطالعہ کر لیجئے۔ میرے خطابات میں ان احادیث کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ”مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل“ میں بھی ان کا تذکرہ ہے، لیکن وہاں متن موجود نہیں ہے۔ یہاں ہم متن کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ:

”وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا

جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے

فَلْيُعَيِّدْ بِيَدِهِ

تو وہ اپنے ہاتھ سے اسے بدلے!

فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ

اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس بُرائی کو روکے)!

اس کو ذرا اچھی طرح نوٹ کر لیجئے کہ نہی عن المنکر کے جن دو درجوں کا بیان یہاں ہوا ہے ان میں سے پہلا درجہ ہے ”نہی عن المنکر بالید“ کا۔ یعنی کوئی بُرائی نظر آئے تو ”زور دست و ضربت کاری“ سے اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس بُرائی سے نمٹنے کے لیے مؤثر قوت موجود ہو۔ بصورت دیگر بندہ مومن کافر ص ہے کہ وہ اس قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ”نہی عن المنکر باللسان“ کا فریضہ ادا کرے۔ یعنی زبان سے لوگوں کو روکا جائے کہ خدا کے لیے اس سے باز آجاؤ، اسے چھوڑ دو۔ زبانی مداخلت میں قلم بھی داخل ہے۔ اس مقصد کے لیے کتابیں اور رسالے شائع کیے جائیں۔ نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لائے جائیں۔ آج نہی

عن المنکر باللسان کا ایک بہت بڑا ذریعہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ہیں۔ آپ گفتگو اور تقاریر کو اس ذریعے سے عام کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی مقرر کی کوئی تقریر دُور دُور تک پہنچ سکتی ہے۔ آج میں یہاں جو تقریر کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے کوئی دوست اس کا کیسٹ لے کر امریکہ یا آسٹریلیا پہنچ جائیں۔ یہیں پتہ بھی نہیں ہوگا اور یہ کیسٹ وہاں پھیل رہا ہوگا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت میرے دروس و خطابات کے کیسٹ لاکھوں کی تعداد میں پوری دنیا میں گردش میں ہیں۔ میں نے حال ہی میں 'حکمت قرآن' کا جنوری فروری ۹۰ء کا جو مشترکہ شمارہ شائع کیا ہے، اس میں دعوت رجوع الی القرآن کی ایک پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ میں اس کے بارے میں بھی خاص طور پر عرض کروں گا کہ جس شخص کو بھی ہمارے اس کام سے کوئی عملی دلچسپی ہے وہ اس شمارے کو ضرور پڑھے اور اس کے مندرجات پر سنجیدگی سے غور کرے۔ اس میں پوری تاریخ بیان کی گئی ہے کہ امت کا تعلق قرآن سے کیوں کمزور پڑا۔ پھر یہ کہ قرآن کی طرف رجوع کا دوبارہ آغاز کب ہوا۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کیا مقام ہے اس کے بعد اب تفسیر قرآن کے جو سلسلے چل رہے ہیں وہ کون کون سے ہیں — اور اس راستے میں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کی خدمات کیا ہیں۔ یہ ساری داستان آپ کو اس ایک پرچے میں مل جائے گی۔ اور اس وقت میرا ذہن اس کی طرف اس لیے منتقل ہوا کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی عمر اور اپنی صلاحیتیں اس کام میں لگانی ہیں۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے پورے پچیس برس ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں میں اس شہر کراچی سے منتقل ہو کر اپنے اس کام کو شروع کرنے کے لیے لاہور گیا تھا۔ اب ۱۹۹۰ء آگیا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری عمر کی ربع صدی بیت چکی ہے کہ قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا ہی میرا اصل مشغلہ رہا ہے۔ ان میں سے چھ سال (۶۵ء تا ۷۱ء) ایسے ہیں کہ ساتھ مطب بھی چل رہا تھا۔ فروری ۷۱ء میں میں نے حرم شریف میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ اب ہمہ وقت یہی کام کروں گا۔ چنانچہ میں نے مطب بند کیا،

۱۔ 'حکمت قرآن' کے مذکورہ شمارے کے مندرجات محترم ڈاکٹر صاحب کی تازہ تالیف 'دعوت رجوع الی القرآن' کا منظرہ پس منظر میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ (مرتب)

پکلیٹس چھوڑی اور اُس وقت کے بعد سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا کوئی لمحہ بھی فکرِ معاش میں بسر نہیں ہوا۔ میں نے اپنی ساری توانائیاں اور قوتیں اسی کام میں لگائی ہیں۔ اور آج مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے یہ دروس قرآن دنیا کے کونے کونے میں سُنے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے اپنے تین بچوں سمیت پچیس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اب اسی انداز میں دے رہے ہیں۔ میرا یہ کام الحمد للہ جاری رہے گا اور یہ بات بڑھتی رہے گی، پھیلیتی رہے گی، لوگوں تک پہنچتی رہے گی۔ اور ہمیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ کہاں کہاں تک یہ باتیں پہنچ رہی ہیں۔

میں نے اس پرچے میں لکھا ہے کہ میں اکتوبر ۸۹ء کے اواخر میں جب حیدر آباد دکن گیا، وہاں ایک روز میری تقریر ہوئی، جس کے کیسٹ رات بھر تیار کیے گئے۔ اگلے روز جب میری تقریر ہوئی تو سات سو کیسٹ تیار ہو سکے تھے، جو سب کے سب فروخت ہو گئے۔ اور یہ کیسٹ وہ شے ہے جو تین منٹ میں کاپی ہو جاتا ہے۔ نہ معلوم اس سے آگے کتنی جگہ پر بات پہنچ رہی ہوگی۔ اور گزشتہ رات ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ وہاں میں نے سیرت النبیؐ کے جلسے میں جو تقریر کی تھی، جس میں ڈیڑھ پورے دو لاکھ سامعین تھے، قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس تقریر میں سے پندرہ منٹ کی تقریر دُور درشن (ٹیلی ویژن) کے نیٹ ورک پر پورے انڈیا میں دکھائی گئی۔ تو یہ بات تو ان شاء اللہ پھیلیتی رہے گی۔ میں اگرچہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں اور اکثر علیل ہوتا ہوں، لیکن بہر حال جب تک جان میں جان ہے اور جب تک بھی یہ اعضاء و جوارح ساتھ دے رہے ہیں یہی کام کرنا ہے، اللہ کے اس پیغام کو پہنچانا ہے۔ نہی عن المنکر باللسان کا یہ کام کرتے رہنا ہے۔ ہم غلط کو غلط کہیں گے، حرام کو حرام کہیں گے، خواہ کسی کو کتنا ہی ناگوار لگے۔ کسی کو نہیں سُننا ہے، نہ سُننے اجمع چھوڑ کر جاتا ہے، چلا جاتے! الحمد للہ اس معاملے میں مجھے تعدد کی کوئی فکر نہیں ہوتی، لیکن بات وہی کہنی ہے جو صحیح ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ آج تک یہ سوال کبھی میرے سامنے نہیں آیا کہ میری بات سے کون راضی ہے، کون ناراض! البتہ میں نے ہر بات کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچا ہے کہ آیا میرا اللہ اس پر راضی ہو گا یا ناراض۔ یا یہ سوچا ہے کہ میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اس کے سوا تیسری بات کبھی سامنے نہیں آتی۔

جہاں تک ”نہی عن المنکر والیہ“ کا تعلق ہے تو اس بارے میں جو بات میں نے ہمیشہ کہی ہے وہی اب کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے ایک منظم جمعیت درکار ہے۔ جب ایسے COMMITTED اور DEDICATED لوگوں کی ایک معتد بہ تعداد جمع ہو جاتے جو اس ٹٹھنکاتی لائحہ عمل پر عمل کر چکے ہوں، جو پہلے خود اپنی زندگی کے اندر حلال و حرام کی پابندی کر رہے ہوں، خود دین پر کار بند ہوں، چھوڑ سہ وسع و طاعت کا نظم اختیار کر کے ایک مضبوط جمعیت فراہم کریں اور ایک بنیاد مرصوح بن جائیں، تب چیلنج کا مرحلہ آئے گا اور طاقت کے بل پر یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ہم یہ منکرات نہیں ہونے دیں گے۔ ہم حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ پہلے ہماری جان جائے گی، اُس کے بعد اللہ کی کوئی حد پا مال ہو سکے گی۔ ہمارے جیتے جی یہ غیر شرعی کام نہیں ہو سکے گا! ہمارا ٹو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وہی الفاظ ہوں گے: اَيُّبَدُلُ الدِّينَ وَاَنَا حَيٌّ۔ ”کیا دین میں تبدیلی کر دی جائے گی جبکہ میں زندہ ہوں؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام تک پہنچائے لیکن اس کے لیے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں طاقت فراہم کرنا ہوگی جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے فراہم کی۔ جب طاقت فراہم ہو گئی تب آپؐ نے تلوار سے جہاد کیا۔ آپؐ کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ تیرہ برس تک اُسی بیت اللہ کا طواف کرتے رہے اور وہیں نماز پڑھتے رہے جہاں دائیں بائیں ہر طرف بُت رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اُس وقت کسی بُت کو نہیں توڑا۔ پہلے طاقت فراہم کی، دعوت، تربیت اور تنظیم کے مرحلے طے کیے، اللہ کے ایسے فدائی اور شہیدانی جمع کیے جو اِن اللہ اشتہائی... الخ“ کی عملی تصویر بن گئے۔ پھر آپؐ کا مشرکین سے براہ راست مسلح تصادم ہوا، بدر و احد کے معرکے ہوئے اور جب آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے ایک لمحے کے لیے بھی ان بتوں کا وجود گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ آپؐ ”جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوْقًا“ کے الفاظ فرما رہے تھے اور ایک ایک بُت کو توڑتے جاتے تھے۔ یہ ہے نبوی طریق انقلاب! یہاں میں نے دو جملوں میں بات کر دی ہے، اگر تفصیل پڑھنی ہے تو اس کے لیے ”ہنج انقلاب نبوی“ کے عنوان سے کتاب موجود ہے۔

اب آیت نہی عن النکح کے تیسرے درجے کی طرف۔ اس حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں:

فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَيَقْلِبْهُ

اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو پھر اپنے دل سے!

یعنی اگر زبانون پر بھی پہرے بٹھا دینے گئے ہوں تو برائی کو دیکھ کر دل کے اندر ایک صدمہ اور ایک رنج اور دکھ اور کرب کا احساس تو ہو فرمایا:

وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ

اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اگر منکرات کو دیکھ کر کسی کی جبین پر بل بھی نہ پڑے اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہو اور وہ اندر سے تلللا نہ اٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کی غیرت ایمانی دم توڑ چکی ہے اور وہ ایمان کی پونجی سے یکسر محروم ہو گیا ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلك!

یہ سلم شریف کی روایت ہے۔ دوسری حدیث بھی سلم شریف ہی کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، یہ بڑی اہم حدیث ہے اور میں اس کے حوالے سے آج ایک بڑا اہم مسئلہ بیان کروں گا جو اس سے قبل میں نے کبھی وضاحت سے عرض نہیں کیا۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

حُضِرْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَرُشَاؤُنَا؛

مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي

کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہیں اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو۔

إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَأَصْحَابٌ

مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ (لوگ) نکلتے تھے جو اس کے، حواری اور اصحاب

ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کے لیے قرآن حکیم میں 'حَوَارِیُّونَ' کا لفظ آیا ہے اور حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے لفظ 'صحابہ' استعمال ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں دونوں لفظ جمع فرما دیئے۔ اب نوٹ کیجئے کہ انبیاء کے حواری اور اصحاب کرتے کیا تھے:

يَا خِذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهِ

وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے

یہ حواری اور اصحاب اپنے نبی کی اقتدا کرتے تھے؛ پیروی کرتے تھے۔ جیسے نماز میں ایک امام ہوتا ہے اور اس کے پیچھے مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِ هُمْ خُلُوفٌ

پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آجائے تھے۔

جیسے ہم ہیں، جیسے آج کی امتِ مسلمہ ہے۔ یہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ یہاں بھی حضورؐ نے ڈھبی باتیں بیان فرمائیں:

يَقُولُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ

کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے۔ اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔

مثلاً بدعات، نئی نئی رسومات اور نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی جاتی رہی ہیں جن کا اللہ کی کتاب میں کوئی حکم ہے نہ اس کے رسولؐ کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے طرز عمل میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری کے زبانی دعوے جو ہیں وہ بہت بلند بانگ ہیں۔ اس طرز عمل کے بارے میں سورۃ الصف میں فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ؟ اے مسلمانو، کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ لیکن کہنے میں کیا جاتا ہے، حضورؐ کے عشق کے دعوے کیجئے، عشق رسولؐ کے اظہار کے لیے بڑی لمبی چوڑی لغتیں پڑھ لیجئے۔ کیا گویا کچھ بھی نہیں! محض زبانِ ہلا دنیا تو بہت آسان ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا طرز عمل یہ تھا کہ کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ آگے آپؐ نے فرمایا:

فَمَنْ جَاهَدَ هُمْ يَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

تو جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدْهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدْهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنے دل سے وہ بھی مومن ہے۔

وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

اور اس کے بعد تو ایمان رانی کے دانے کے برابر بھی نہیں!

گویا کہ احساس ہی نہیں رہا منکرات پھیل رہے ہیں، بے حیاتی عام ہو رہی ہے، بدعت پھیل رہی ہیں رسومات کے طور پر طومار ہیں۔ اور جو کچھ آجکل شادیوں میں ہو رہا ہے وہ آپ کو معلوم ہے یہ سب ہو رہا ہے اور ہمارے احساسات کے اوپر جوں تک نہیں رنگ رہی معلوم ہوا کہ **وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ** کے زمرے میں آرہے ہیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور ہمیں اپنے ایمان کی تجدید کی توفیق عطا فرمائے۔

کیا مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج جانتے ہے؟

اب یہاں اس حدیث کی رو سے جو ایک اہم مسئلہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قسمی سے عام طور پر سنی مسلمانوں میں ایک خیال عام ہو گیا ہے کہ اصحاب اقتدار خواہ کتنے ہی فاسق و فاجر اور ظالم و جابر ہوں، اُن کے طور طریقے خواہ کیسے ہی ہوں، اُن کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ آپ کو کفر کا حکم نہ دیں۔ اصل میں بعض احادیث اس مضمون کی ہیں کہ جب تک کفر لواح کا حکم نہ دیا جائے بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اُن احادیث کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہم ہوا اور عام طور پر اہل سنت میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ شاید خروج کسی شکل میں جائز نہیں! اور میں اسی کا نتیجہ اس وقت کی سنی دنیا میں دیکھ رہا ہوں کہ بدترین جبر و استبداد کے باوجود کہیں بیداری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میرے لیے آجکل یہ مسئلہ بڑے گہرے غور و فکر کا موجب ہو گیا ہے کہ اگرچہ دنیا میں سنیوں کے مقابلے میں شیعہ تعداد کے اعتبار سے بہت قلیل ہیں لیکن اس صدی میں اگر کہیں انقلاب برپا کیا تو شیعوں نے کیا

ایک بڑی متحد بادشاہت کا تختہ الٹا اور اپنی فقہ کے مطابق ایک نظام قائم کیا۔ جبکہ دوسری طرف موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک پوری سٹی دنیا میں جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور الاخوان المسلمون جیسی عظیم تحریکوں کی موجودگی کے باوجود کہیں بھی انقلاب کے کوئی آثار ابھی دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ آخر اس کا کوئی سبب تو ہے! غور طلب مسئلہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ یسٹ مسلمان سُنّ ہو کر کیوں رہ گئے ہیں؟ یہ بڑا حسّاس مسئلہ (SENSITIVE ISSUE) ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا میں نے آج تک اس پر کبھی گفتگو نہیں کی ہے۔

لیکن کچھ دنوں سے میں شدت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ لازمی طور پر فکر اور نظریے کے اندر کہیں کوئی خامی موجود ہے! مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ معاشی مسئلے پر کھڑے ہو جائیں گے، سیاسی مسئلے پر کھڑے ہو جائیں گے، کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کو جمع ہو جائیں گے۔ سینکڑوں لوگ جانیں بھی دے دیں گے، لیکن استحصالی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی منظم کوشش کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی منظم کوشش اسی دور میں ایرانیوں نے کر کے دکھا دی ہے۔ جیسا کچھ بھی اُن کا دین ہے، جو بھی اُن کی فقہ ہے اور جو بھی اُن کے تصورات ہیں اُن سے ہمیں لاکھ اختلاف سہی، لیکن انہوں نے اسے نافذ تو کر کے دکھا دیا ہے۔ اور ہم نے کیا کیا؟ ہمارے ہاں بادشاہتیں چل رہی ہیں، ان بادشاہوں کے لیے ایک ایک محل کی تعمیر پر اربوں ڈالر صرف ہوئے ہیں، جہاں بادشاہ سلامت کو سال بھر میں زیادہ سے زیادہ چار چھ دن قیام کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ اُسی ملک کے اندر جا کر دیکھیے کہ انسان بالکل حیوانوں کی طرح رہتے ہوئے بھی نظر آئیں گے۔ تو یہ نظام ہمارے ہاں کیوں نہیں بدل رہا؟

ان دنوں خاص طور سے مجھ پر یہ سوچ جو بہت زیادہ طاری ہے تو اس کی وجہ بھی میں بیان کیے دیتا ہوں۔ گزشتہ دنوں جب جہاد افغانستان بڑی شدت کے ساتھ جاری تھا اور روسی افواج ابھی افغانستان سے نہیں نکلی تھیں اُس وقت ایک بات متواتر سننے میں آ رہی تھی کہ روسی ترکستان کی ریاستوں سمرقند و بخارا وغیرہ میں جہاد افغانستان کے اثرات بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں، ان میں دینی جذبات زندہ ہو رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ روس کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور افغانستان میں اس کی مداخلت کے نتیجے میں ان تمام ریاستوں میں بغاوت

ہو جانے گی لیکن میں حیران ہوں کہ بغاوت ہوتی تو سب سے پہلے یورپی علاقوں میں ہوتی۔
 روس کی گرفت ذرا کمزور پڑی تو یورپ میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور
 چوتھا ملک روسی استبداد کی زنجیریں توڑنا نظر آیا۔ پھر یہ کہ روس کی اپنی ریاستوں مثلاً بالٹک اسٹیٹس،
 لیتوانیا وغیرہ کے اندر بغاوت ہو گئی۔ گورباچوف نے جا کر معافیاں مانگی ہیں
 خورشید میں کی ہیں کہ ہم روسی دستور میں "طلاق کا حق" رکھ دیتے ہیں، خدا کے لیے اس وقت علیحدہ
 نہ ہوں، آئندہ کے کسی مرحلے کے لیے ہم باقاعدہ دستوری راستہ کھول دیں گے لیکن انہوں
 نے اس کی ایک نہیں مانی! اس کے بعد اگر کوئی بغاوت کی خبر سننے کو ملی تو آذربائیجان سے
 جہاں شیعہ مسلمان آباد ہیں۔ یہی ریاستیں ساری سن پڑی ہوئی ہیں اور ابھی تک ان میں کہیں سے
 بیداری کی کوئی لہر نہیں اٹھی اور دورِ حاضر کا اتنا عظیم جہاد، جہادِ افغانستان بھی اُن کے تنِ مُردہ
 میں جان نہ ڈال سکا، جس نے "حی اُٹھے مُردے تری آواز سے" کے مصداق کثیر لویں
 تک کو زندہ کر دیا، جن کے بارے میں "پہلی تے ٹھس کر سی" کا لطیفہ مشہور ہے!

میرے اپنے غور و فکر کی حد تک اس کی وجہ یہی ہے کہ سنی اسلام میں مجھ علمائے اس خیال کو عام
 کر دیا ہے کہ حاکموں کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ حاکم چاہے کیسا بھی ہو جب تک وہ آپ
 کو کفر کا حکم نہ دے آپ اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے محل میں شرابی نشی
 کرتا ہو، برعاشی کرتا ہو، کرتار ہے۔ لیکن بغاوت صرف اُس وقت ہو سکتی ہے جب وہ آپ
 کو کفر کا حکم دے۔ اس خیال نے سنی تصورات کے اندر ایک طرح کا انفعالی (PASSIVE)
 انداز پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ جو چیلنج کرنے والا ACTIVE انداز ہے، وہ آج ہمیں پوری
 سنی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ حکمرانوں کے طرزِ عمل پر گرفت کرنے کے سلسلے میں
 اس صحیح حدیث کے الفاظ کس قدر واضح اور دو ٹوک ہیں۔ لیکن حدیث کے ضمن میں اکثر و بیشتر
 ہوتا یہ ہے کہ ایک حدیث پر توجہ کو مرکوز کر دیا جاتا ہے اور دوسری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے،
 پورے ذخیرہ احادیث پر متوازن انداز میں نظر نہیں رکھی جاتی۔ غور کیجئے کہ احادیث میں جہاں
 وہ حدیث موجود ہے کہ جب تک اربابِ اقتدار کفرِ بواح کا حکم نہ دیں، آپ ان کے خلاف

بغاوت نہیں کر سکتے، وہاں ایسی احادیث بھی تو موجود ہیں کہ جب ایسے لوگ برسرِ اقتدار ہوں جن کی روش یہ ہو کہ ”یقولون مالا يفعلون و يفعلون مالا یؤمرون“ تو ان کے خلاف بندہ مومن کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فمن جاهدہم بیدہ فهو مؤمن**! اگر بغاوت نہیں ہو سکتی تو یہ جہاد بالیدکس شے کا نام ہے؟ اگر ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تو یہ الفاظ حضورؐ نے کیوں استعمال کیے؟ **فمن جاهدہم بیدہ فهو مؤمن**، **ومن جاهدہم بلسانہ فهو مؤمن**، **ومن جاهدہم بقلبہ فهو مؤمن**، **ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل**۔

ہمارے ہاں اس فکر کو دراصل عام طور پر اہل حدیث علماء نے عام کیا ہے، درزِ امام عظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہی ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے۔ علماء حدیث اور فقہائیں یہی تو فرق ہے کہ عالم حدیث کی زیادہ توجہ حدیث کے الفاظ پر ہوتی ہے، جبکہ فقہ حدیث کے مفہوم کو مرکزِ توجہ بناتا ہے۔ وہ احادیث کو جمع کرتا ہے، ان کا تقابل کرتا ہے اور پھر کوئی نتیجہ نکالتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو پہلے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبانی طور پر کیجئے۔ اگر اس کا اثر نہ ہو تو ہتھیاروں کے ذریعے سے انہیں سدھا کیجئے۔ چنانچہ مخفی کے اندر اس بات کی اجازت موجود ہے۔ امام صاحبؒ نے اس کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ طاقت اتنی فراہم ہو جانی چاہیے کہ کامیابی یقینی ہو جائے، یا کم از کم اس کا ۵۱ فیصد امکان ہو۔ یہ نہیں کہ چند آدمی کھڑے ہو کر نعرہ لگائیں اور پچاسی چڑھ جائیں۔ اور بات ختم ہو جائے۔ بلکہ پہلے دعوتِ تنظیم اور تربیت کے ذریعے آپ ایسی منظم قوت فراہم کر لیں،

۱۔ حضرت ابن مسعودؓ ہی سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں: **سیکون امراء بعدی یقولون مالا يفعلون و يفعلون مالا یؤمرون** (مسند احمد و حدیث ۴۳۶۱۳) ترجمہ: ”عنقریب میرے بعد ایسے امراء (حکام) آئیں گے جو کہیں گے وہ بات جس پر عمل نہیں کریں گے اور کریں گے وہ کچھ جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا“

پھر آپ انتہائی قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے دین میں بغاوت حرام نہیں ہے۔ اس معاملے میں میری رائے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف کتاب و سنت سے اقرب ہے۔

اس دور میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے، بغاوت کا ایک بدل
ALTERNATIVE سامنے آیا ہے اور اب طاقت کا استعمال مسلح تصادم کے بغیر بھی ممکن ہے۔

وہ یہ کہ میدان میں نکل کر اس طرح کے بھرپور مظاہرے اور PICKETING کرنا کہ حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑ جائیں! آپ کو یاد ہو گا کہ ضیاء الحق صاحب کے راشل لاء کو ابھی صرف تین برس بھی نہیں ہوتے تھے، جب اہل تشیع نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا تھا اور اس جاندار راشل لاء کے چیف راشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ناک رگڑ والی تھی۔ اسے ان کے تمام مطالبات ماننے پڑے تھے اور ایرانی شیعوں نے تو اس دور کی سب سے بڑی مثال قائم کر کے دکھا دی۔ انہوں نے منظم مظاہرے کیے، لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور ہزاروں کی تعداد میں جانیں قربان کر دیں۔ خاص طور پر اُس روز جس دن شاہ نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا، کئی ہزار ایرانیوں کے لاشے میدان میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ اور شہنشاہ ایران کو اپنی لاکھوں کی فوج اور حلیضوں کی حمایت کے باوجود اس طرح راہ فرار اختیار کرنا پڑی کہ
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!

نہی عن المنکر میں ولین ہدف — فتنۃ النساء

ہم اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے منکرات کا جائزہ لیں تو ان میں ایک بہت بڑا منکر آزادی نسواں کا فتنہ ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا تَزَكُّتُ بَعْدِي فِتْنَةٌ أَصَوُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ
النِّسَاءِ (متفق علیہ)

”میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں کے فتنے سے زیادہ نقصان دہ فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا“

ہمارے معاشرے میں اس "فتنۃ النساء" نے درحقیقت بہت سی گندگی پھیلانی ہے۔ عورتوں کا نشوونما، ان کا تہرج، ان کا بن سنور کر نگلنا اور اخبارات کا ایسی حیا باختر عورتوں کی تصویروں کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑا اٹھالینا واقعہً اس وقت ہمارے معاشرے کا ایک بہت تباہ کن فتنہ ہے اور یہ ایسا بڑا منکر ہے جس کے خلاف اقدام کی ضرورت ہے۔ نہی عن المنکر کے ضمن میں یہ بات جان لیجئے کہ ہمیں یقیناً ایک تدریج سے چلنا ہوگا اور اس تدریج میں سب سے مقدم اس فتنۃ النساء کی سرکوبی ہے، اس لیے کہ معاشرے کے اندر سب سے زیادہ اثر اسی کا پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں دوسرے منکرات بھی موجود ہیں اور یہیں ان سب سے نبرد آزما ہونا ہے۔ مثال کے طور پر سود ایک بہت بڑا منکر ہے، زمینداریاں، جاگیرداریاں اور تقسیم دولت کا غلط نظام یہ سب ایسے منکرات ہیں جن کی بیخ کنی کرنا ہے لیکن چونکہ ہمارے دین میں سب سے زیادہ تفصیلاً عائلی قوانین اور نظام معاشرت کے بارے میں ہیں اور یہ معاملہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے لہذا اولین ترجیح اسی کو حاصل ہوگی۔ اور اسلام کا عائلی اور معاشرتی نظام ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے عوام سب سے زیادہ جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں۔ لہذا منکرات کے خلاف ہماری تحریک مزاحمت (RESISTANCE MOVEMENT) جب بھی اٹھے گی اس کا آغاز اسی سے ہوگا!

پچھلے دنوں ہمارے ہاں اس فتنۃ النساء کے بعض ایسے مظاہر سامنے آتے ہیں جو ایک عجیب تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک طرف تو عورتوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں برابری کے حقوق دیتے جائیں مثلاً میڈیکل کالجوں میں داخلہ اپن میرٹ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اگر لڑکی کے نمبر زیادہ ہیں تو اس کا حق ہے کہ اس کو داخلہ ملے۔ یورپ کی نقالی میں مساوات مرد و زن کا مطالبہ کرنے والی خواتین کو اس مساوات کا نمونہ یورپ میں جا کر دیکھنا چاہیے کہ کوئی بوڑھی نحیف عورت بس میں کھڑی ہوگی اور کوئی جوان آدمی بھی اس کے لیے اپنی سیٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہاں کی عورت برابر کے حقوق شہریت رکھتی ہے اور اس کو اس معاشرے میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے ہاں مساوات مرد و زن کے نعرے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف حال یہ ہے کہ اسمبلی میں خواتین کی نشستیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر برابری کا معاملہ ہے تو یہ کیوں میدان میں آکر الیکشن نہیں لڑتیں؟ اگر ان کے لیے مردوں کے شاہد بٹانہ لکیشن

لڑنے کی اجازت بھی رکھی گئی ہے تو پھر ان کی علیحدہ نشستوں کے کیا معنی؟ اگر بے نظیر عام ایکشن لڑ کر ایک سے زائد جگہ سے کامیاب ہو سکتی ہیں اور اگر عابدہ حسین مردوں کے مقابلے میں ایکشن جیت سکتی ہیں تو باقی خواتین اسی راستے سے کیوں نہیں آتیں؟ اور آپ نے یہ طرہ تماشا ملاحظہ کیا کہ اس نئی حکومت کے قیام سے لے کر اب تک حکومت اور اپوزیشن کے مابین جس واحد بات پر اتفاق رائے ہوا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کی علیحدہ نشستوں کا معاملہ برقرار رکھا جائے! اناطہ سرگرمیاں ہے...! اس عرصے میں اور کسی پہلو سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، کسی اور معاملے پر حکومت اور اپوزیشن کا اتفاق رائے نہیں ہوا حتیٰ کہ اب تک کسی قسم کی کوئی قانون سازی بھی نہیں ہو سکی، لیکن اس ایک معاملے میں جو اسلام کے مزاج کے صریح خلاف ہے، فریقین کا اتفاق رائے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے مدنی تصورات میں کوئی فرق نہیں، ان کی ذہنیتیں ایک سی ہیں، حکومت ہو یا اپوزیشن جدید مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب میں دونوں رنگے ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں، لہذا اس مسئلے پر ان میں اتفاق ہے۔ اور ہمارے مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب نے تو عورتوں کی نشستیں ایک دم دو گنی کر دی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے، اور کمال یہ ہے کہ اگرچہ اس مسئلے پر مولانا سمیع الحق صاحب کا بیان آیا ہے اور انہوں نے اسے غیر اسلامی اور مغربی تہذیب کا منظر قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا ہے کہ اس کے باوجود یہ مسلم لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ تو وہی روش ہوئی جس سے ان آیات اور احادیث میں روکا گیا ہے کہ غلط بات کو غلط بھی کہنا لیکن ساتھ پھر بھی دیتے رہنا۔ اگر یہ غلط ہے تو غلط کا ساتھ کا ہے کو دے رہے ہیں؟ ان سے ترک تعلق کیوں نہیں کرتے؟

اس بارے میں میرا موقف بالکل واضح ہے اور میں بار بار اسے بیان کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اس طرح کی مخلوط اسمبلیوں میں کسی عورت کا رکن آسہلی ہونا ہی اسلام کے خلاف ہے۔ اگر آپ عورت کے وزیر اعظم ہونے پر اعتراض کرتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ عورت کا وزیر ہونا بھی تو قابل اعتراض ہے۔ اس کا تو کام ہے کہ گھر کے اندر اپنی ذمہ داریاں سنبھالے اسلام مرد اور عورت کے لیے الگ الگ دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ آپ خواتین کو آسہلی میں لانا چاہتے

ہیں تو ان کے لیے علیحدہ اسمبلی بنادیں۔ خواتین ووٹر ہی خواتین ارکان اسمبلی کا انتخاب کریں اور وہ ان کی نمائندہ بن کر اپنی علیحدہ اسمبلی میں بیٹھیں۔ اور یہ طے کر دیا جائے کہ جو بھی قانون سازی ہو وہ پہلے مردوں کی اسمبلی سے پاس ہو اور اس کے بعد اگر اسے خواتین کی اسمبلی سے بھی اکثریت ملے تب وہ کامیاب قرار دی جائے۔ اسی طرح میڈیکل کی تعلیم کے لیے بھی خواتین کے علیحدہ کالج بنائے جائیں، جن کا اپنا میرٹ ہو۔ اس وقت ہمارے پاس اتنی خواتین پروفیسرز اور ڈاکٹرز موجود ہیں کہ وہ پورے پورے کالج چلا سکتی ہیں۔ اسی طرح خواتین کے ہسپتال بھی علیحدہ ہوں جہاں سے ان کی تعلیمی ضروریات پوری ہو سکیں۔ تاہم یہ سب کچھ اُسی وقت ہوگا جب مغربی تہذیب کا بھجوت سر سے اترے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں تو ٹھیک ہے، انہیں ہر معاملے میں برابری کا حق دیکھئے کہ پھر وہ کھلم کھلا میدان میں آکر ایکشن بھی لڑیں اور اوپن میرٹ پر داخلہ بھی حاصل کریں! بہر حال یہ دو طرفہ معاملہ قابل قبول نہیں ہے کہ ایک طرف تو اسمبلی کی سطح پر خواتین کی مخصوص نشستیں ہوں اور ان کا بالواسطہ (INDIRECT) الیکشن ہو رہا ہو، اور دوسری طرف میڈیکل کالجوں کے داخلے میں اوپن میرٹ کا معاملہ کیا جائے کہ لڑکے لڑکیاں سب کو برابری کی بنیاد پر داخلہ مل سکے۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ان طالبات کی اکثریت شادی کے بعد میڈیکل پروفیشن کو ترجیح دیتی ہے۔ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو پھر ساری عمر شادی نہیں کرتیں لیکن ظاہر بات ہے یہ ایک خلاف فطرت زندگی ہے جو ہمارے دین کے مزاج کے پھیر خلاف ہے۔ اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔ جسے میری سنت پسند نہیں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے! معلوم ہوا کہ یہ چیزیں پسندیدہ نہیں ہیں۔ لیکن چلیے اگر یہی کچھ کرنا ہے تو آپ ہمیں دو طرفہ مار تو نہ لاریں۔! دین کے اعتبار سے تو یہ دونوں چیزیں غلط ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ دو طرفہ پالیسی خود ان کے اپنے موقف اور اپنے معیارات کے اعتبار سے بھی تضاد پر مبنی ہے۔ اس تضاد کو رفع ہونا چاہیے۔!

میں نے یہاں اس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ مولانا مسیح الحق صاحب نے اس کو غلط اور غیر اسلامی کہنے کے باوجود یہ بھی کہا کہ ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس طرح تو برائی

کو بُرائی کہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اللہ تعالیٰ مجھے سوتے ظن سے بچائے، یہ تو ایک ایسی کوشش معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اس کھاتے میں بھی نام لکھوا دیا جائے کہ ہم نے بُرائی کو بُرائی کہا ہے، لیکن دوسری طرف اپنی سیاسی مصلحت پر بھی آپ نے آئے۔ حدیث نبویؐ تو یہ تبارہی ہے کہ بُرائی کو بُرائی کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ ”وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ“ کے مصداق جو لوگ بُرائی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں اُن سے قطع تعلق کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر از روئے فرمان نبویؐ دل بھی باہم مل جائیں گے، جڑ جائیں گے۔ اور سب کے دلوں پر ایک سارنگ چڑھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے!!

عذابِ الہی سے نجات کی واحد راہ

یہ ہماری آج کی گفتگو کا آخری موضوع ہے۔ اس سلسلے میں میں نے قرآن حکیم کے دو مقامات کا انتخاب کیا ہے، جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے تو اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے جاتے ہیں جو آخری وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ درنگیہوں کے ساتھ بالعموم گھن بھی پس جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (الانفال: ۲۵) کہ لوگو، بچتے رہو اللہ کے اُس عذاب سے جو تم میں سے صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا جو بدکار تھے۔ بلکہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو دوسرے لوگ بھی جو اگرچہ اُس عزمِ خوری میں ملوث نہ ہوں، اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اس سے بچاؤ کی ضمانت صرف ان کے لیے ہے جو نہی عن المنکر کے فریضے کو آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ
وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ

”سو کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں کچھ ایسے لوگ جن میں خیر کا اثر باقی رہ گیا تھا کہ وہ زمین میں فساد سے منع کرتے رہتے، مگر تھوڑے کہ جنہیں ہم نے بچا لیا ان میں سے۔ اور سچھے پڑے رہے ظالم اُسی چیز کے جس میں انہیں عیش ملا اور تھے وہ گناہ گار!“

یعنی پہلی قوموں میں سے جن لوگوں نے آخری دم تک یہ شرط پوری کی کہ وہ نہی عن المنکر کا فرضیہ سرانجام دیتے رہے، اللہ نے انہیں عذاب سے بچا لیا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ شرط پوری نہیں کی وہ اُسی عذاب یافتہ قوم کے ساتھ لپیٹ میں لے لیے گئے۔ اس آیت کا آخری ٹکڑا بڑا عجیب ہے۔ اگر آپ اپنے اس وقت کے معاشرے کو بھی دیکھیں تو وہی نقشہ نظر آئے گا جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: **وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أَتَوْا فِيهِ** — ”اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی تھی وہ اُسی طور طریقے کے پیچھے پڑے رہے جس میں انہیں دولت و ثروت حاصل ہوئی تھی۔“ دن رات ایک ہی فکر ہے ایک ہی دھن سوار ہے اور ایک ہی سوچ طاری ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے اور پھر اپنے اتلوں تللوں، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں اسراف و تبذیر کے ذریعے اس دولت کی بھرپور نمائش کی جائے۔ فرمایا: **وَكَاثِبًا مُّجْرِمِينَ** — ”اور وہ سب مجرم تھے! اور اسی جرم کی پاداش میں ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ بہر حال اس وقت اس پوری آیت کا درس دینا مقصود نہیں، صرف **الْأَقْلِيلَ** مِمَّنْ **أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ** کے اعتبار سے حوالہ دیا جا رہا ہے کہ ان میں بہت ہی قلیل تعداد میں وہ لوگ تھے جو برائی سے روکتے رہے اور انہی کو ہم نے نجات دے دی! یہی مضمون سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۶۵ میں بھی وارد ہوا ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ
الشُّعُورِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ مِّمَّا
كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

”پس جب انہوں نے بھلا دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بُرائی سے اور کچھ گناہگاروں کو بُرے عذاب میں سبب ان کی نافرمانی کے!“

اس آیہ مبارکہ میں یہود کے ایک قبیلے کا ذکر ہے جو ساحل سمندر پر آباد تھا۔ یہود کو سبت دہشتہ کا پورا دن یادِ الہی میں بسر کرنے کی ہدایت تھی اور اس روز ان کے لیے کسی ذمیوی کا رعبار کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے سبت کے قانون کو توڑنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا کہ ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑتے تو نہیں تھے، لیکن سارا دن ساحل کے ساتھ ساتھ کھدائی کرتے رہتے اور بڑے بڑے گڑھے بنا کر ان میں سمندر کا پانی لے آتے تھے جن میں مچھلیاں بھی آ جاتی تھیں۔ اگلے روز اتوار کو جا کر وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے تھے۔ گویا کہ سبت کے قانون کے اصل مقصد یعنی عبادت و ریاضت، ذکر و فکر، دعا و مناجات اور تلاوتِ کتابِ الہی کو کمسر نظر انداز کر کے اس کے بجائے سارا دن دنیا کے دھندے میں لگے جڑھتے، لیکن قانونی طور پر اس حیلے کا سہارا لیتے اور صاف صاف کہتے کہ ہم تو سبت کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم ہفتہ کو تو مچھلیاں نہیں پکڑتے، بلکہ اتوار کو پکڑتے ہیں۔ اس پر قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ وہ تھا جو اس جرم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اگرچہ اس جرم میں ملوث نہیں تھے اور اس کام کو غلط بھی سمجھتے تھے، لیکن وہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کو روک ٹوک کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ گویا نبی عن اللہ کو کافر فیضہ سرانجام نہیں دے رہے تھے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو اللہ کے فضل و کرم سے خود بھی اس نافرمانی سے بچے ہوئے تھے اور جو لوگ یہ غلط روش اختیار کیے ہوئے تھے انہیں وہ روکتے ٹوکتے بھی تھے۔ اس سے پہلی آیت نمبر (۱۶۴) میں ان میں سے دوسری قسم کے لوگوں کا قول بیان ہوا ہے: لَمَّا تَعْظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُمْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا۔ ”کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے؟“ یعنی اللہ تعالیٰ تو اب ان کو ہلاک کر کے ہے گا۔ یہ قوم اب بار آنے والی نہیں ہے، تم خواہ مخواہ انہیں روکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہے ہو؟ کیوں ان کے پیچھے لگے ہو تے ہو اور اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہو؟ ان کا جواب تھا: مَعَذَرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكَمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ۔ ”ہمارے رب کے حضور عذر پیش کرنے کی غرض سے اور شاید کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر ہی لیں!“ یعنی ہم تو اپنا نبی

عن المنکر کافر فیضہ ادا کرتے رہیں گے کیونکہ ہمیں تو اللہ کے حضور معذرت پیش کرنی ہے کہ اے اللہ ہم تو انہیں آخری وقت تک روکتے رہے، ہم اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ اور پھر کیا عجب کہ ہمارے سمجھانے سے اللہ کسی کے دل میں تقویٰ پیدا کر دے اور اسے اپنا طرز عمل بدلنے کی توفیق عطا فرما دے! اب اس کے بعد فرمایا گیا: فَلَمَّا سَوَّوْا مَآذُکُمْ وَآیَہ — ”تو جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس ساری نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی۔“ ان تک جو بھی نہی عن المنکر کافر فیضہ سرانجام دیا جا رہا تھا، اس سے ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اَمْجِیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ الشُّوْءِ — ”ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے رہے تھے۔“ وَآخِذْ نَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابِہِمْ بَیِّنٍۭ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ اور جو لوگ ظلم کی روش اختیار کیے ہوئے تھے انہیں ہم نے ایک بہت بُرے عذاب میں پھڑپھڑایا بسبب اس کے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے!

قرآن حکیم کے یہ دو مقامات ہیں جن کی رو سے عذاب الہی سے نجات کی ضمانت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو نہی عن المنکر کافر فیضہ آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا اثر ہویا نہ ہو، لوگ مانیں یا نہ مانیں!!

آخر میں اسی مضمون سے متعلق ایک حدیث کا مطالعہ کر لیجئے۔

اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ حذیفہ نہیں جو صاحبِ سِرِّ النَّبِیِّ (نبیؐ کے راز دان) کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر انہیں بعض افراد کے بارے میں نام بنام بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حذیفہ یہ میرا ایک راز ہے، اسے کسی کو بتانا نہیں! اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے نفاق کا پردہ چاک نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن ابی کی نمازہ بن نازہ بھی پڑھا دی جو کہ منافقین کا سردار تھا۔ میرے دروس میں یہ مضمون بڑی تفصیل سے آچکا ہے کہ اسلامی ریاست میں CATEGORIES بس دو ہی ہیں — مسلم اور غیر مسلم۔ باقی رہے منافق تو وہ قانونی طور پر مسلمان ہی شمار ہوتے ہیں۔ بہر حال حضورؐ نے

چونکہ انہیں ایک راز کے طور پر منافقین کے نام بتادیئے تھے اس لیے ان کا نام صاحبِ سر النبیؐ پڑ گیا تھا۔ اور یہاں یہ بھی نوٹ کیجئے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تھا: ”اے حذیفہؓ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھ رہا ہوں، کہیں میرا نام تو ان میں نہیں تھا؟ اپنے ایمان کے بارے میں اس درجے احساس تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، کہیں اس دولتِ ایمان پر نفاق کا ڈاکہ نہ پڑ جائے! اور ہم اس درجے بے پرواہیں کہ ہمیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے تو اپنے مومنین حقیقی ہونے پر مکمل یقین حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاحِ احوال کی توفیق عطا فرمائے!

عَنْ حَذِيفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
 حضرت حذیفہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تمہیں لازماً نبی کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا

أَوَلَيْوَسَكُنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ

ورنہ پھر اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی جانب سے ایک بڑا شدید عذاب بھیجے گا

ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ

پھر تم اسے پکارو گے، لیکن تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی۔

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ

اسے روایت کیا امام ترمذیؒ نے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آج اس کا کیا سبب ہے کہ ہم اللہ کے حضور دعائیں کرتے ہیں، اگر گڑبڑاتے ہیں، لیکن فتنے ہیں کہ پھیلتے ہی جا رہے ہیں، فساد کی آگ بڑھتی ہی جا رہی ہے، امن و امان ختم ہو چکا ہے، رات کا چین اور دن کا اطمینان رخصت

ہو چکا ہے، بِالْفَاظِ قَرَأَنِي: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ ”بحر و بر میں فساد پھیل چکا ہے،“ لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ اللہ کے عذاب کی ایک صورت ہے اور نہ ہی ہمیں اس کی فکر ہے کہ اس عذاب سے بچنے کا راستہ کون سا ہے!!

آج کے درس کا حاصل یہ ہے کہ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے نہی عن المنکر! اس کا کم سے کم درجہ جسے اختیار کرنا دنیاوی عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے وہ باللسان ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جدوجہد کی جائے اور ایسی جمعیت اور قوت فراہم کی جائے جو نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ یہی دو کام ہیں جو ہم اللہ کی تائید و توفیق سے کر رہے ہیں۔ انجمن خدام القرآن کی سطح پر قرآن کی یہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت — اور پھر تنظیم اسلامی کے نام سے ایک قوت فراہم کرنے کی کوشش! اللہ تعالیٰ کو جیسے کچھ منظور ہوگا، جب منظور ہوگا، اس کے نتائج ظاہر ہو جائیں گے۔ ہمیں اس کی

کوئی فکر نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ہم ”قَالُوا مَعذَرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكَمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ“ کے مصداق اللہ کی جناب میں ایک معذرت پیش کرنے کے قابل ہو جائیں اور پھر کیا معلوم کہ رب اللہ تعالیٰ کے توفیق عطا فرمادیں۔ کل کی کسے خبر ہے، کون کہہ سکتا تھا کہ عمر بن حرا اپنے گھر سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے چلا تھا، وہ ان کی خدمت میں اپنی تلوار اپنے گلے میں لٹکا کر حاضر ہو جانے لگا، جیسے غلام لٹکایا کرتے تھے۔ حالات کو بدلتے ہوئے اللہ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں ہے۔ لہذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہرگز کسی غفلت یا تساہل کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ آج ہم نے جن آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ کا مطالعہ کیا ہے، ان سب کے متن پر مثل ایک ڈوورق آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ پڑھیے، اسے مزید جان بنائیے اور اس سے آپ پر جو بھی حقیقت منکشف ہو اس پر اللہ تعالیٰ سے عمل کی توفیق طلب کیجیے! اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولستأثر المسلمین والمسلمات

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

علماء و صلحا کے کمرے کا اصل کام
اور عذاب الہی سے نجات کی واحد راہ

بِاللهِ وَالتَّوْبَةِ وَمَا أَنزَلَ إِلَيْهِ مَا تَخَذُوا لَهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنْ كَثِيرٌ
مِّنْهُمْ يَفْسُقُونَ ۝

المائدہ: آیات ۸۱ تا ۸۲

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ
يَسْأَلُونَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّنَ الْمُجْتَهِدِينَ ۚ وَكُنَّا
وَالْقِيمِ الدِّينِ ظَلَمُوا مَا أَتَوْا بِهِمْ وَكَانُوا هُمْ صَرِينًا ۝

ہود: آیت ۱۱۶

فَلَمَّا كَسَبُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَجْبَنَّا الَّذِينَ يَبْهَوْنَ عَنِ الشُّعْرِ وَأَخَذْنَا
الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَهِيمٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

الاعراف: آیت ۱۴۵

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ
يُسْأَلُونَ فِي الْأَسْوَاقِ وَالْعُدُوكِ وَأَكْثَرُ الشُّعْرِ لَيْشَ مَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَوْ لَا يَهْتَمُّمُ الَّذِينَ يَزِينُونَ وَالْخَبَّازُ عَنْ قَوْلِهِمْ
الْإِسْمُ وَأَكْثَرُ الشُّعْرِ لَيْشَ مَا كَانَ يَصْنَعُونَ ۝

المائدہ: آیات ۶۲، ۶۳

لَوْنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَى
إِسْرَءِيلَ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝
كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝
نَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَقُولُونَ الَّذِينَ نَقَرُوا لَيْشَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمُ أَنْفُسُهُمْ
أَن يَسْخَطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ لَهُمْ خِلَافٌ ۚ وَلَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ۝

عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم
يقول : . مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيَعِزِّهِ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ
فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ ، رواه مسلم .

عن ابن مسعود رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم

قال : . مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُونَ
وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ ، ثُمَّ إِنَّمَا تَخْلَفُ مِنْ بَعْدِهِمْ
خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ
فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ
مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ، رواه مسلم .

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : « إِنَّ أَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقْصُ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ كَانَ الرَّجُلُ يُلْقَى الرَّجُلَ فَيَقُولُ : يَا هَذَا أَتَى اللَّهَ وَدَعَا مَا تَصْنَعُ فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَكَ ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنْ الْغَدِ وَهُوَ عَلَى حَالِهِ فَلَا يَمْنَعُهُ ذَلِكَ أَنْ يَكُونَ أَكِيلَهُ وَشَرِيْبَهُ وَقَعِيدَهُ فَلَمَّا فَعَلُوا ذَلِكَ ضَرَبَ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ ، ثُمَّ قَالَ : ﴿ لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ ﴾ إِلَى قَوْلِهِ ﴿ فَاسْقُون ﴾ ثُمَّ قَالَ : « كَلَّا وَاللَّهِ لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذَنَّ عَلَى يَدِ الظَّالِمِ وَلَتَأْطِرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا أَوْ لَيُضْرِبَنَّ اللَّهُ بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ » رواه أبو داود ، والترمذی وقال : حديث حسن . هذا لفظ أبي داود ، وَلَفْظُ التِّرْمِذِيِّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ فِي الْمَعَاصِي نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوا فَجَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ فَضَرَبَ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ، جَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَكِنًا فَقَالَ : لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ حَتَّى تَأْطِرُوهُمْ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا . قَوْلُهُ « تَأْطِرُوهُمْ » : أَيْ تَعْطِفُوهُمْ . « وَلَتَقْصُرُنَّهُ » : أَيْ لَتَحْبِسُنَّهُ . »

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : ” بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے

سے ملاقات پر کہتا تھا: اے فلاں! اللہ سے ڈرو، اور جو کام تم کر رہے ہو اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے؛ لیکن پھر جب ان کی اگلے روز ملاقات ہوتی تھی تو اس کے باوجود کہ وہ شخص اپنی اسی روش پر قائم ہوتا تھا یہ بات اس پہلے شخص کو اس کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور مجالست سے نہیں روکتی تھی، تو جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے آیات قرآنی (سورۃ مائدہ ۷۸ تا ۸۱) ”لَعْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَءِیْلَ سَآءَ لِقَاؤُهُمْ فَاسْقُوْنَهُمْ نَارًا“ تک تلاوت فرمائیں اور پھر فرمایا: ”ہرگز نہیں! خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہو گا اور بدی سے روکنا ہو گا اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا ہو گا، اور اسے جبراً سختی کی جانب موڑنا اور اس پر قائم رکھنا ہو گا ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مانند کر دے گا اور پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت فرمائے گا جیسے ان پر کی تھی! اس حدیث کو روایت کیا امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے۔ متذکرہ بالا الفاظ روایت ابنی داؤد کے ہیں۔ روایت ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو (ابتداء میں) ان کے علمائے ان کو ان سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور (اس کے باوجود) انہوں نے ان کی کشتی اور باہم کھانا پینا جاری رکھا تو اللہ نے ان کے دل بھی باہم مشابہ کر دیئے اور پھر ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حد و دے سے تجاوز کرتے تھے۔“ اس کے بعد آنحضرتؐ اٹھ کر بیٹھ گئے درآں حالیکہ اس سے قبل آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور پھر آپؐ نے فرمایا: ”نہیں! اس سہی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب تک تم ان کو سختی کی جانب موڑ نہ دو گے (تمہاری ذمہ داری ادا نہ ہوگی)“ امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے!

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :
 « وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ
 لَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُوهُ فَيَلَا يَسْتَجَابُ لَكُمْ ،
 رواه الترمذی وقال : حدیث حسن .

امریا المعروف اور نہی عن المنکر
 باہم لازم و ملزوم

ایک گاڑی کے دو پہیے یا ایک ہی تصویر کے دو رخ

(۱) نشان باری تعالیٰ — النحل ۹۰ | (۲) اُمت کافر منضی — آل عمران ۱۰

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ
وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْبَغْيِ وَيُعْظِمُ لَكُمْ تَذَكُّرُونَ

(۲) تقاضائے فطرت و حکمت۔ لقمن ۱۰

يُبَيِّنُ أَقِيمِ الصَّلَاةَ وَامْرُءًا مَعْرُوفًا وَانَّهُ عَنِ الشُّكْرِ وَأَصْدَقَ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٥٠﴾

(۳) نشان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ————— الاعراف ۱۵۷

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الَّذِي يَأْتِيهِمُ بِالْبَيِّنَاتِ وَهُوَ
مَكْنُوءٌ بَيْنَهُمْ فِي التَّوْرَةِ إِلَىٰ أَنْ يُخْرِجَهُمُ الْكُفْرَ أَفْ يَكْفُرُونَ
يَعْلَمُونَ أَنَّ الْمَسْجِدَ الَّذِي يُقَامُ فِيهِ لِلَّهِ لَخَيْرٌ مِّنْ الْمَسْجِدِ
الَّذِي بَنَوْا لِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِهِمْ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ أَفْ يَكْفُرُونَ

(۴) شان صحابہ رضی اللہ عنہم ————— التوبہ ۷۱

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ
يَأْمُرُونَ بِالْعَدْلِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(۵) صالحین اہل کتاب کے اوصاف

آل عمران ۱۱۳-۱۱۴

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ

قَالِمَةً يَتَّبِعُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنَا أَيْلٌ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُسَارِعُونَ فِي الْغَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

(٦) **كيفيت منافعتن** ————— التوبه ٤٤

الْمُتَّقُونَ وَالْمُتَّقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَمُرُّونَ
بِالنُّكْرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ

(۴) اُمت کافر منصبی — ب۔ آل عمران ۱۱۰

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلْعَالَمِينَ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(۸) اُمتِ مسلمہ کے لیے سنہ نکاتی

لا تَحْمِلْ كَانْقِطَةُ عُرُوجٍ — اَبْلَ عَمَانَ ۲۴۱۰۳۰

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقْوَاهُ وَلَا تَمُوتُوا إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٧﴾ وَأَعِزِّمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَذَكِّرُوا أَنَّ اللَّهَ يُنْعِمُ عَلَيْكُمْ أِنْ أَنتُمْ عَاذِلَةٌ فَإِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿١٠٨﴾ بِرِغْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا ۚ إِنَّكَ لَكُمُ الْيَوْمَ لَعَنَةٌ مُّكْتَدُونَ ﴿١٠٩﴾ وَإِذْ لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا قَدْ نَجَوْا مِنَ النَّارِ فَكُنْتُمْ لَكُمُ الْيَوْمَ أَعْيُنٌ عَلَىٰ غَدِرَةٍ ۚ فَذَرُواهُنَّ وَأَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ إِنَّكُم مِّنْ أَعْيُنٍ عَلَىٰ غَدِرَةٍ ۚ فَلَوْلَا بَرَاءَةُ اللَّهِ عَلَيْكَ لَخَسَمَ اللَّهُ وَجْهَكَ ۚ إِنَّهُ مُبْدِئُ الْخَاسِرِينَ ﴿١١٠﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَدِرِ وَتُوفَّيْنَاكَ فِي الْآخِرِ ۚ سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِحَمْدِ الْعَالَمِينَ ﴿١١١﴾ وَأَنْتَ بِأَعْيُنِنَا ۚ فَبِذِكْرِ اللَّهِ لِيُؤْمِنُوا ۚ إِنَّكَ إِذْ تُنَادِي بِذِكْرِهِمْ أَنْ يَنْصَرُوا بِلَاحِدٍ مِّنْكُمْ وَيَقُولُوا شَاعَرُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ قَوْمٌ مُّكْذِبُونَ ﴿١١٢﴾

(۹) اصحاب اقتدار کا فرض عین — الحج

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(۱۰) سرفروش اور جانباز اہل ایمان

کے اوصاف کا ذرۂ نسیم۔۔۔ التوبہ ۱۱ تا ۱۲

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لِيُقَاتِلَ لَهُمْ سُوَّةُ الْأَعْدَاءِ ۚ وَعَدًا عَلَيْهِمْ حَقًّا فِي النَّفْسِ الْيَوْنَةِ وَالْجَنَّةِ ۚ وَالْقُرْآنُ ۚ وَأَنْ أَوْفَىٰ بِهِمْ مِنْ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْرَأْ إِلَىٰ إِلَهِكَ الَّذِي بَاعَ مِنْهُمْ ۚ وَذَلِكَ هُوَ الْقَوْلُ ۚ التَّائِبُونَ الْعُمِدُونَ الْعَسَافُونَ

الَّذِينَ يُشْجِدُونَ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهِي عَنْ الْمُنْكَرِ
وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ (١١)

— **Судья** —

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
اور سب مل کر اللہ کے دین کو مضبوط کرلو

مسلمانوں کی موجودہ پستی کا علاج

تجوّز فرمودہ

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب قدس سرہ

مُرتّبہ

حضرت مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی دامت برکاتہم

ناشران قرآن لمیٹڈ: اُردو بازار لاہور

مولانا محمد الیاسؒ کا مذہبی رویہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاصہ شغف اور تہجد و بندگی کے نتیجے میں گذشتہ ساٹھ ستر سال سے مخصوص انداز میں تبلیغ دین اور شاعت اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ تجلج واقف ہے۔ اس محنت اور جدوجہد کے پیچھے اس محترم بھائی کے فکر کا رفرما ہے جو عرصہ دراز کے تعامل سے مزید گہرے اور بخت ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کے موجودہ زوال، انحطاط اور دین سے دوری بھی ایک طرح کے 'بیماری' ہے جس کا 'علاج' ہی دراصل آج امت کے اکابرین کے لئے اصل کام ہے اور چونکہ نبیؐ آخر الزماں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امت کے خاص خطہ، رنگ اور نسل اور زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام ردئے ارضی پر آباد نسل آدم علیہ السلام پر مشتمل ہے۔ لہذا اس 'بیماری' کے 'علاج' کیلئے بھی نہ کوئی ایک ہی طریقہ علاج مطلوب ہے اور نہ کافی دشانی۔

مولانا محمد الیاسؒ کا مذہبی رویہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز فکر اور استدلال کو مولانا محمد احتشام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتابچے کے شکل دے دی تھی۔ ہمیں حیرت ہے کہ آج سے پورے صدی قبل حکیم ہر طرف انگریز کے غلامی کے ظلمت چھائے ہوئے تھے ایک مرد خود آگاہ اور خدا مست نے امت مسلمہ کے 'بیماری' کے کسی صحیح تشخیص فرمادی کہ آج بھی اس پر کوئی اصول اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے (بزور اضافہ یا تعمیر کا فرق الگ بات ہے)۔ مزید برآں صحیح تشخیص کے بعد علاج بھی تجویز فرمایا اور ایک اصول رہنما دے دیے۔ تحریر ہے: "اب جبکہ مقصد زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے معالجے کی نوعیت معلوم ہو گئی تو طریقہ علاج کے تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ اس نظریے کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاء اللہ نافع اور سودمند ہو گا۔"

کتنی بصیرت افزا رہے یہ حقیقت کہ جیسے ایک ماہر سرجن اور طبیب کا دوسرے معالج سے مرض کے نوعیت کے بارے میں اتفاق کے باوجود طریقہ علاج میں بعینہ

اختلاف ہوتا ہے اور یہ ہمارا روزانہ کا تجربہ ہے۔ عین اس طرح امت مسلمہ کے 'معالجین' ہوا کا براہ امت میں ان میں طریقے علان اور تبد و جد کے سمت کا فرق نہ غیر فطر ہے نہ پریشانی کے۔

اُس محترم کے کتنے عالِ ظرف ہے کہ جسے طریقے پر انہوں نے اپنے جماعت کو اٹھایا اور چلایا اس پر یقین کامل اور غیر متزلزل رسول کے باوجود 'دوسرے طریقے' علاج کے لئے سیدہ کشادہ رکھتے ہیں تحریر ہے :

"ہم نے اپنے نارسا فہم کے مطابق مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے لئے ایک نظام عمل تجویز کیا ہے جسے کوئی الحقیقت اسلامی زندگی یا اسلاف کے زندگی کا نمونہ کہا جاسکتا ہے جسے کا اجمال نقشہ آپ کے خدمت میں پیش ہے۔" 'بیماری' کے تشخیص میں علاوہ دیگر امور کے جس طرح 'نہی عن المنکر' کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسوس کہ وہ چیز آج اس مشرف کے علمبرداروں میں نظر نہیں آتی۔ مثلاً حضرت ابوسعید خدریؓ کے مشہور حدیث جس میں نہی عن المنکر کے تین درجے ہیں : ماتحت بُرائی کا رد کن، زبانی سے رد کن اور دل میں بُرا جاننا (اور خود رد کن) اور یہ دل میں بُرا جاننا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس کے وضاحت میں تحریر ہے ۔ "اور یہ آخری صورت ایمان کے بڑے کمزوری کا درجہ ہے۔ پس جس طرح آخری درجہ اضعاف ایمان کا ہوا اس طرح پہلا درجہ کمال دعوت اور کمال ایمان کا ہوا۔"

مولانا احتشام الحسنیؒ کے یہ دقیق تحریر تبلیغی نصاب، کا مستقل جزو ہے۔ افادہ عام کے لیے اسے تحریر کا عکس 'تبلیغی نصاب' کے جہیز ایڈیشن سے حاصل کر کے جسے کتب خانہ شان اسلام اردو بازار نے شائع کیا ہے، مدیر قارئین کیا جا رہا ہے۔ ٹائٹل کے صفحے کا عکس ایک مختلف ایڈیشن سے حاصل کیا گیا ہے جو ناشرانہ قرآن ملیڈ کا شائع کردہ ہے۔

اظہارِ حقیقت

مُحَمَّدٌ وَصَلَّى عَلَى رَسُولِ الْكَرِيمِ

سیدی و مولائی زبۃ الفضل اقدوۃ العلماء حضرت مولانا محمد الیاس صاحبِ مہجد کے خاص شغف اور انہماک اور دیگر بزرگانِ ملت اور علماء اُمت کی توجہ اور برکت اور عملی جدوجہد سے ایک عرصہ سے مخصوص انداز میں تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ بخوبی واقف ہے۔

مجھ بے علم اور سیاہ کار کو ان مقدس ہستیوں کا حکم ہوا کہ اس طرز تبلیغ اور اس کی ضرورت اور اہمیت کو قلمبند کیا جائے تاکہ سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہو اور نفع عام ہو جائے۔

تعمیل ارشاد میں یہ چند کلمات نذرِ قسط اس کیے جاتے ہیں جو ان مقدس ہستیوں کے دریائے علوم و معارف کے چند قطرے اور اس باغیچہ دینِ محمدی کے چند خوشے ہیں جو انتہائی عجلت میں جمع کیے گئے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی یا کوتاہی نظر سے گزرے تو وہ میری اغرضِ قلم اور بے علمی کا نتیجہ ہے۔ نظرِ لطف و کرم سے اس کی اصلاح فرمادیں تو موجبِ شکر و منت ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہ! اپنے فضل و کرم سے میری بد اعمالیوں اور سیہ کاریوں کی پردہ پوشی فرمادیں اور مجھے اور آپ کو ان مقدس ہستیوں کے طفیل سے اچھے اعمال اور اچھے کردار نصیب فرمادیں اور اپنی رضا و محبت اور اپنے پسندیدہ دین کی اشاعت اور اپنے برگزیدہ رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری کی دولت سے سرفراز فرمادیں۔

مدرسہ کاشف العلوم
بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی

خاک پاتے بزرگان
محمد حشام الحسن
۱۸۔ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ
خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ

آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل جب دنیا کفر و ضلالت، جہالت و سفاهت کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی بطحا کی سنگ لالچ پہاڑیوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہوا اور مشرق و مغرب شمال و جنوب غرض دنیا کے ہر ہر گوشہ کو اپنے نور سے منور کیا اور ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں بنی نوع انسان کو اس معراج ترقی پر پہنچایا کہ تاریخ اسلام اس کی نظیویش کرنے سے قاصر ہے اور رشد و ہدایت صلاح و فلاح کی وہ مشعل مسلمانوں کے ہاتھ میں دی جس کی روشنی میں ہمیشہ شام و ترقی پر گامزن رہے اور صدیوں اس شان و شوکت سے دنیا پر حکومت کی کہ ہر مخالفت قوت کو ٹکڑا کر پاش پاش ہونا پڑا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ناقابل انکار ہے لیکن پھر بھی ایک پاریز داستان ہے جس کا بار بار دہرانا تسلی بخش ہے اور نہ کار آمد اور مفید جبکہ موجودہ مشاہدات اور واقعات خود ہماری سابقہ زندگی اور ہمارے اسلاف کے کارناموں پر بدنام داغ لگاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ زندگی کو جب تاریخ کے اوراق میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم عزت و عظمت، شان و شوکت، دبہ و جہت کے ننھا مالک اور اجارہ دار ہیں، لیکن جب ان اوراق سے نظر ہٹا کر موجودہ حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو ہم انتہائی ذلت و خواری افلاس و ناداری میں مبتلا نظر آتے ہیں نہ زور و قوت ہے نہ زر و دولت ہے نہ شان و شوکت ہے، نہ باہمی اخوت و اُلفت۔ نہ عادات اچھی نہ اخلاق اچھے نہ اعمال اچھے نہ کردار اچھے۔ ہر برائی ہم میں موجود اور ہر بھلائی سے کوسوں دور، اختیار ہماری اس زبوں حالی پر خوش ہیں اور بر ملا ہماری کمزوری کو اچھا لاجاتا ہے اور ہمارا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اسی پر بس نہیں بلکہ خود ہمارے جگر گوشے نئی تہذیب کے دل دادہ نوجوان اسلام کے مقدس اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں، بات بات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور اس شریعت مقدسہ کو ناقابل عمل انگو اور بے کار گردانتے ہیں۔ حقل حیران ہے کہ جس قوم نے دنیا کو سیراب کیا وہ آج کیوں تشنہ ہے جس قوم نے دنیا کو تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا۔ وہ آج کیوں غیر مذہب اور غیر متمدن ہے۔

رہنمایان قوم نے آج سے بہت پہلے ہماری اس حالت زار کا اندازہ لگایا اور مختلف طریقوں پر ہماری اصلاح کے لیے جدوجہد کی مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آج جب کہ حالت بد سے بڑھ چکی اور آنے والا زمانہ، ماضی سے بھی زیادہ پرخطر اور تاریک نظر آ رہا ہے۔ ہمارا خاموش بیٹھنا اور عملی جدوجہد نہ کرنا ایک ناقابل تلافی جرم ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی عملی قدم اٹھائیں ضروری ہے کہ ان اسباب پر غور کریں جن کے باعث ہم اس ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔ ہماری اس سستی اور انحطاط کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں اور ان کے ازالہ کی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں لیکن ہر تدبیر ناموافق و ناکام ثابت ہوئی جس کے باعث ہمارے رہبر بھی یاس و ہراس میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارے مرض کی تشخیص ہی پورے طور پر نہیں ہوئی یہ جو کچھ اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل مرض نہیں، بلکہ اس کے عوارض ہیں۔ پس تا وقتیکہ اصل مرض کی جانب توجہ نہ ہوگی اور مادہ تحقیقی کی اصلاح نہ ہوگی۔

عوارض کی اصلاح ناممکن اور محال ہے۔ پس جب تک کہ ہم اصل مرض کی ٹھیک تشخیص اور اس کا صحیح علاج معلوم نہ کر لیں۔ ہمارا اصلاح کے بارے میں لب کشائی کرنا سخت ترین غلطی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانون الہی ہے جو ہماری دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کا تاقیام قیامت ضامن ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض تشخیص کریں اور خود ہی اس کا علاج شروع کر دیں۔ بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید سے اپنا اصل مرض معلوم کریں اور اسی مرکزِ رشد و ہدایت سے طریق علاج معلوم کر کے اس پر کاربند ہوں۔ جب قرآن حکیم قیامت تک کے لیے مکمل دستور العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے۔

مالکِ ارض و سما و جل و علا کا سچا وعدہ ہے کہ رُوئے زمین کی بادشاہتِ خلافت

مومنوں کے لیے ہے۔
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ۖ
اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان کو ضرور روتے زمین کا خلیفہ بنائے گا اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ مومن ہمیشہ

(نور ۶)

کفار پر غالب رہیں گے اور کافروں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

وَلَوْ كُنْتُمْ كُفْرًا أَزِيدُوا ۚ وَلَوْ أَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ ظَلَمُوا تَوَّابًا ۖ
اور اگر تم سے یہ کافر ہوتے تو ضرور بیٹھ پھیر کر بھاگتے پھرنے پاتے کوئی یار و مددگار اور مومنوں کی نصرت اور مدد اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہی ہمیشہ سر بلند اور سرفراز رہیں گے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ
اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی اور تم وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا ۚ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ
ہمت مت ہارو اور درخ مت کرو۔ اور غلبہ میں رہو۔
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۖ وَبَلَّغَ الْعِزَّةَ
غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول
وَرَسُولِهِ ۖ وَلِلْمُؤْمِنِينَ ۖ
اور مسلمانوں کی۔ (متفقون ۱۶)

مذکورہ بالا ارشادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عزت، شان و شوکت سر بلندی و سرفرازی اور بہرتری و خوبی ان کی صفت ایمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ان کا تعلق خدا اور رسول کے ساتھ مستحکم ہے (جو ایمان کا مقصد ہے) تو سب کچھ ان کا ہے اور اگر خدا نخواستہ اس رابطہ تعلق میں کمی اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے تو پھر سراسر خسران اور ذلت و خواری ہے جیسا واضح طور پر بتلایا گیا۔
وَالْعَصْفُ ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۖ
قسم ہے زمانہ کی انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے۔

تو آسویا لُحِقُوا ۖ وَالْحَقُّ وَتَوَّابًا صَوَابًا لِّصَّبْرِ ۖ
(العصر)
ہمارے اسلاف عزت کے منتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور ہم انتہائی ذلت و خواری میں مبتلا ہیں پس معلوم ہوتا کہ وہ کمال ایمان سے متصف تھے اور ہم اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں جیسا کہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔

سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبْقِي
مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا مِنَ الْقُرْآنِ
يَعْنِي قَرِيبَ هِيَ اِيسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام
کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن
کے صرف نقوش رہ جائیں گے۔

اب غور طلب امر یہ ہے اگر واقعی ہم اس حقیقی اسلام سے محروم ہو گئے جو خدا اور رسول کے
یہاں مطلوب ہے اور جس کے ساتھ ہماری دین و دنیا کی فلاح و بہبود وابستہ ہے تو کیا
ذرعیہ ہے جس سے وہ کھوٹی نعمت واپس آئے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے وحی اسلام
ہم میں سے نکال لی گئی اور ہم جسدِ بے جان رہ گئے۔

جب صحیفہ آسمانی کی تلاوت کی جاتی ہے اور اُمۃ محمدیہ کی فضیلت اور برتری کی علت
غایت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمت کو ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا
تھا۔ جس کی وجہ سے خیر الائمہ کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

دنیا کی پیدائش کا مقصد اصلی خدا واحد لا شریک لہ کی ذات و صفات کی معرفت ہے
اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے کہ جب تک بنی نوع انسان کو میراثیوں اور گندگیوں سے پاک
کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جاتے۔ اسی مقصد کے لیے ہزاروں رسول اور
نبی بھیجے گئے اور آخر میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے سید الانبیاء والمرسلین کو مبعوث فرمایا اور
الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاسْتَمْتَّ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي كَامْرُوءَ سَلَاكِيَا۔

اب چونکہ مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی ہر بھلائی اور برائی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا تھا۔
ایک مکمل نظام عمل دیا جا چکا تھا۔ اس لیے رسالت و نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ اور جو کام پہلے
نبی اور رسول سے لیا جاتا تھا وہ قیامت تک اُمۃ محمدیہ کے سپرد کر دیا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط
اے اُمت محمدیہ! تم افضل اُمت ہو تم کو
لوگوں کے نفع کے لیے بھیجا گیا ہے تم بھلی
باتوں کو لوگوں میں پھیلاتے ہو اور بُری باتوں سے
ان کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(آل عمران ۱۱۴)

وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ
وَيُأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
اور چاہیے کہ تم میں ایسی جماعت ہو کہ لوگوں
کو خیر کی طرف بلائے اور بھلی باتوں کا حکم نہ لے

الْمُنْكَرُطَ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝
(آل عمران ۷۱)

اور بڑی بڑی باتوں سے منع کرے اور صرف وہی لوگ فلاح والے ہیں جو اس کام کو کرتے

ہیں۔

پہلی آیت میں ”خیر اُرم“ ہونے کی وجہ یہ بتلاتی کہ تم بھلائی کو پھیلانے ہو اور برائی سے روکتے ہو دوسری آیت میں حصر کے ساتھ فرمادیا کہ فلاح وہی ہو صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ صاف طور پر بیان کر دیا کہ اس کام کو انجام نہ دینا لعنت اور پھٹکار کا موجب ہے۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَٰءِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۖ طَبَشَسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (مائدہ ۷۸)

بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر لعنت کی گئی تھی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے جو بُرا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے باز نہ آتے تھے۔ واقعی ان کا یہ فعل بے شک بُرا تھا۔

اس آخری آیت کی مزید وضاحت احادیث ذیل سے ہوتی ہے۔

(۱) وَفِي الشُّنَنِ وَالْمُسْنَدِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانَ إِذَا عَمِلَ الْعَامِلَ فِيهِمْ بِالْخَطِيئَةِ تَوَجَّعَهُ النَّاسُ تَعَرُّيًّا فَقَالَ يَا هَذَا اتَّقِ اللَّهَ فَإِذَا كَانَ مِنَ الْعَدِيبِ أَلْسُهُ وَآكَلَهُ وَشَارِبُهُ كَأَنَّهُ لَمَسِيَّةٌ عَلَى خَطِيئَةٍ يَا لَأَمْسٍ فَلَمَّا رَأَى عَرَّ وَجَلَّ ذَا يَدٍ مِنْهُمْ ضَرَبَ بِقُلُوبٍ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ ثُمَّ لَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی خطا کرتا تو روکنے والا اس کو دھمکاتا اور کہتا کہ خدا سے ڈر پھر لگے ہی دن اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا۔ گویا کل اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں، جب حق عز وجل نے ان کا یہ بُراؤ دیکھا تو بعض کے قلوب کو بعض کے ساتھ خلط کر دیا اور ان کے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما

نَبِيٍّ مِّمَّ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذُلًّا
بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ وَالَّذِي نَفْسُ
مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَآتَمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَكْفُرُونَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذَنَّ عَلَيَّ يَدُ السَّعْفَةِ
وَلَتَأْخُذَنَّ عَلَيَّ الْحَقُّ أَطْرًا وَلَيَضْرِبَنَّ
اللَّهُ بِقُلُوبٍ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ ثُمَّ
يَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ -

(۲) وَفِي سُورَةِ أَبِي دَاوُدَ ابْنِ مَاجَةَ
عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ
مَا مِنْ نَجَلٍ يَكُونُ فِي قَوْمٍ يَعْمَلُ
فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي يَقْدُرُونَ عَلَى أَنْ
يُغَيَّرُوا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيَّرُونَ إِلَّا
أَصَابَهُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَمُوتُوا
(۳) وَرَوَى الْأَضْبَهَانِيُّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
لَا تَزَالُ لَدَى اللَّهِ إِلَّا اللَّهُ تَنْفَعُ مَنْ قَالَ مَا
وَتَرُدُّ عَنْهُمْ الْعَذَابَ وَالنَّقْمَةَ مَا لَمْ
يَسْتَحْفَظُوا بِحَقِّهَا قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَ
مَا إِلَّا سَتَحْقَافٌ بِحَقِّهَا قَالَ يَظْهَرُ
الْعَمَلُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَلَا يُنْكَرُ
وَلَا يُغَيَّرُ -

ترغیب

۴ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى

السلام کی زبانی ان پر لعنت کی اور یہ اس
لیے کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی اور حد سے
تجاوز کیا۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس
کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے تم ضرور اچھی
باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے منع کرو
اور چاہیے کہ یہ قوتِ نادان کا ہاتھ پکڑو
اس کو حق بات پر مجبور کرو ورنہ حق تعالیٰ
تمہارے قلوب کو بھی خلطِ ملط کر دیں گے
اور پھر تم پر بھی لعنت ہوگی جیسا کہ پہلی آیتوں
پر لعنت ہوئی۔

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر
کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص گناہ کرتا
ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس کو نہیں
روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ اپنا
عذاب بھیج دیتے ہیں یعنی دنیا ہی میں ان
کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے
(۳) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیشہ
کہہ لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اپنے پڑھنے والے کو نفع
دیتا ہے اور اس سے عذاب و بلا دور کرتا ہے
جب تک کہ اس کے حقوق کی بے پروائی
نہ ہوتی جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس کے
حقوق کی بے پروائی کیا ہے حضور اقدسؐ

نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی کھلے طور پر کی جائے پھر نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ ان کے بند کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو میں نے چہرہ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آتی ہے۔

حضور اقدسؐ نے کسی سے کوئی بات کی اور حضورؐ فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے میں مسجد کی دیوار سے لگ گئی تاکہ کوئی ارشاد ہو

اس کو سنوں حضور اقدسؐ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بھلی باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے منع کرو مبادا وہ وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور میں اس کو قبول نہ کروں اور تم مجھ سے سوال کرو اور میں اس کو پورا نہ کروں اور تم مجھ سے مدد چاہو اور

میں تمہاری مدد نہ کروں حضور اقدسؐ نے صرف یہ کلمات ارشاد فرمائے اور منبر سے اتر گئے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت دنیا کو قابل وقعت و عظمت سمجھنے لگے گی تو اسلام کی وقعت و بہت اچھے قلوب سے نکل جائے گی۔

عَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَرَفْتُ فِي وَجْهِهِ أَنَّ قَدْ خَضِرَهُ شَيْءٌ فَتَوَضَّأَ وَمَا كَلَّمَ أَحَدًا فَلَصَقْتُ بِالْحَجَرَةِ أَسْتَمِعُ مَا يَقُولُ فَقَعَدَ عَلَيَّ الْمُنْبِرُ نَحْبَهُ اللَّهُ وَاشْتَفَى عَلَيْهِ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ لَكُمْ مُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَانْتَهُوا عَنِ الْمُنْكَرِ قَبْلَ أَنْ تَدْعُوا فَلَا أُجِيبُ لَكُمْ وَتَسْأَلُونِي فَلَا أُعْطِيكُمْ وَتَسْتَصْرِفُونِي فَلَا أَنْصُرْكُمْ فَمَا نَزَلَ عَلَيْهِمْ حَتَّى نَزَلَ

(ترغیب)

۵۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا عَظَّمْتَ أُمَّتِي الدُّنْيَا نَزَعْتُ مِنْهَا هَيْبَتَهُ الْإِسْلَامِ وَإِذَا تَرَكْتَ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ خَرِمَتْ بَرَكَهُ الْوَحْيِ وَإِذَا تَنَابَتْ

اُمَّتِي سَقَطَتْ مِنْ عَيْنِ اللَّهِ۔ اور جب ام بالمعروف اور نہی عن المنکر کو
 دیکھا اے اللہ میں نے اسے
 الحکیم القرمی (ی)

چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم
 ہو جائے گی اور جب آپس میں ایک دوسرے
 کو سب و شتم کرنا اختیار کرے گی تو اللہ جل
 شانہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

احادیث مذکورہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ام بالمعروف و نہی عن المنکر کو
 چھوڑنا خدا وحدہ لا شریک کی لعنت اور غضب کا باعث ہے اور جب امت محمدیہ
 اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب و آلام اور ذلت و خواری میں مبتلا کر دی جائے
 گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی اور یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ
 اُس نے اپنے فرض منصبی کو نہیں پہچانا اور جس کام کی انجام دہی کی ذمہ دار تھی اس سے
 غافل رہی یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان
 کا خاصہ اور جزو لازمی قرار دیا اور اس کے چھوڑنے کو ایمان کے ضعف و انحلال کی
 علامت بتلایا۔ حدیث ابو سعید خدری میں ہے۔ مَنْ مَرَّ أَيْ مِنْكُمْ مُنْكَرٌ فَلْيُعِزَّهُ
 بِيَدِهِ فَإِنَّ لَمْ يَسْتَطِعْ فَلْيَسَاهُ فَإِنَّ لَمْ يَسْتَطِعْ فَيَقْلِبْهُ وَذَلِكَ
 أَوْفَعُ الْإِيمَانِ۔

یعنی تم میں سے جب کوئی شخص بُرائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں سے
 کام لے کر اس کو دُور کرے اور اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اور اگر اس کی بھی
 طاقت نہ پائے تو دل سے۔ اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے پس
 جس طرح آخری درجہ ضعف ایمان کا ہوا۔ اسی طرح پہلا درجہ کمال دعوت اور کمال ایمان کا
 ہوا۔ اس سے بھی واضح تر حدیث ابن مسعود کی ہے۔ مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ قَبْلِي

إِلَّا كَانَ لَهُ فِي أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ
 ثُمَّ إِنَّمَا تَخَلَّفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَفْعَلُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَقُولُونَ
 مَا لَا يُؤْمَرُونَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ
 بِلسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ

مَنْ اِلَيْمَانِ حَبَّةُ خَدْوَلٍ (مسلم) یعنی سنتِ الہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے یہ جماعت نبی کی سنت کو قائم رکھتی ہے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتی ہے یعنی شریعتِ الہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے۔ اس کو بعینہ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں درابھی فرق نہیں آنے دیتے لیکن اس کے بعد شروفتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو طریقہ نبی سے ہٹ جاتے ہیں انہما فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے شریعت نے حکم نہیں دیا۔ سو ایسے لوگوں کے خلاف جس شخص نے قیامِ حق و سنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مومن ہے اور جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکا اور دل کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں اس پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اب رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔

اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو امام غزالیؒ نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے:-
 ”اس میں کچھ شک نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا ایسا زبردست رکن ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس کو انجام دینے کے لیے حق تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اگر خدا نخواستہ اس کو بلائے طاق رکھ دیا جائے اور اس کے علم و عمل کو ترک کر دیا جائے تو اَلْعِیَاضُ بِاللّٰهِ نُبُوتُ مَا یَکْدُرُ عَلٰیہِ الْاِذَا مَآءٌ گار۔ دیانت جو شرافتِ انسانی کا خاصہ ہے، مضل ہو کر افسردہ ہو جائے گی۔ کاہلی اور سستی عام ہو جائے گی۔ گمراہی اور ضلالت کی شاہراہیں پھیل جائیں گی۔ جہالت عالمگیر ہو جائے گی۔ تمام کاموں میں خرابی آجائے گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں خراب ہو جائیں گی۔ مخلوق تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس تباہی اور بربادی کی اس وقت خبر ہوگی جب روزِ محشر کو خدا سے بالا و برتر کے سامنے پیشی اور باز پرس ہوگی۔“

افسوس صد افسوس! جو خطرہ تھا وہ سامنے آگیا، جو کھٹکاتھا آنکھوں نے دیکھ لیا۔ كَانَ اَمْرًا لِلّٰهِ تَدْرًا مَّقْدُورًا ۝ فَاتَا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ

اس سرسبز ستون کے علم و عمل کے نشانات مٹ چکے، اس کی حقیقت و رسوم کی برکتیں نیست و نابود ہو گئیں لوگوں کی تھکیر و ذلیل کا سکہ قلوب پر چم گیا۔ خدائے پاک کے ساتھ قلبی تعلق مٹ چکا اور نفسانی خواہشات کے اتباع میں جانوروں کی طرح بے باک ہو گئے۔ روئے زمین پر ایسے صادق مومن کا ملنا دشوار و کیا باری ہی نہیں بلکہ معدوم ہو گیا جو اظہار حق کی وجہ سے کسی کی ملامت گوارا کرے۔

اگر کوئی مومن اس تنہا ہی اور بربادی کے ازالہ میں سعی کرے اور اس سنت کے احیاء میں کوشش کرے اور اس مبارک بوجھ کو لے کر کھڑا ہو اور آستینیں چڑھا کر اس سنت کے زندہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تو یقیناً وہ شخص تمام مخلوق میں ایک ممتاز اور نمایاں ہستی کا مالک ہو گا۔

امام غزالیؒ نے جن الفاظ میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا ہے وہ ہماری تنبیہ اور بیداری کے لیے کافی ہیں

ہمارے اس قدر اہم فریضہ سے غافل ہونے کی چند وجوہ معلوم ہوتی ہیں :-
پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس فریضہ کو علماء کے ساتھ خاص کر لیا۔ حالانکہ خطابات قرآنی عام ہیں جو امت محمدیہ کے ہر فرد کو شامل ہیں اور صحابہ کرام اور خیر القرون کی زندگی اس کے لیے شاہد عدل ہے :-

فریضہ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو علماء کے ساتھ خاص کر لینا اور پیران کے بھروسہ پر اس اہم کام کو چھوڑ دینا ہماری سخت نادانی ہے۔ علماء کا کام راہِ حق تیلانا اور سیدھا راستہ دکھلانا ہے پھر اس کے موافق عمل کرنا اور مخلوق خدا کو اس پر چلانا یہ دوسرے لوگوں کا کام ہے اس کی جانب اس حدیث شریف میں تنبیہ کی گئی ہے۔

بیشک تم سب کے سب نگہبان ہو
اور تم سب اپنی رعیت کے بارے
میں سوال کیے جاؤ گے۔ پس بادشاہ
لوگوں پر نگہبان ہے وہ اپنی رعیت

اَلَا تَرَكَكُمْ رَاعٍ وَتَكُنُّمْ
مَسْئُولًا عَنْ رَاعِيَّتِهِ
فَلَا دَمِيرَ الَّذِي عَلَى النَّاسِ
رَاعٍ عَلَيْهِمْ وَهُوَ

کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور مرد اپنے گھروالوں پر نگہبان ہے، اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد پر نگہبان ہے وہ ان کے بارے میں سوال کی جاوے گی اور غلام اپنے مالک کے مال پر نگہبان ہے، وہ اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائیگا پس تم سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاوے گا۔

مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَالرَّجُلُ
رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ
وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَالْمَرْأَةُ
رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ
بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ
مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ
رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ
وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ
فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ
مَسْئُولٌ عَنْ مَرْعِيَّتِهِ

اور اسی کو واضح طور پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

حضور اقدسؐ نے فرمایا دین سر اسر نصیحت ہے (صحابہؓ نے) عرض کیا کس کے لیے۔ فرمایا اللہ کے لیے اور اللہ کے رسولؐ کے لیے اور مسلمانوں کے مقتداؤں کے لیے اور عام مسلمانوں کیلئے

قَالَ الدِّينُ النَّصِيحَةُ
قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلَّهِ
وَلِرَسُولِهِ وَلَا ئِمَّةٍ
الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ
(مسلم)

اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ علماء کا کام ہے تب بھی اس وقت فضاء کا مقتضی یہی ہے کہ ہر شخص اس کام میں لگ جائے اور اعلا۔ کلمۃ اللہ اور حفاظت دین متین کے لیے کمر بستہ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ہم خود اپنے ایمان میں نچپتہ ہیں

تو دوسروں کی گمراہی ہمارے لیے نقصان دہ نہیں جیسا کہ اس آیت شریفہ کا مفہوم ہے۔

اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَضُرُّكُمْ

مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ
ہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں
(بیان القرآن) (ماخذ ۵- ع ۱۴)

لیکن وحییت آیت سے مقصود نہیں جو ظاہر میں سمجھا جا رہا ہے اس لیے کہ معنی حکمتِ خداوندیہ اور تعلیماتِ شرعیہ کے بالکل خلافت ہیں۔ شریعتِ اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتلایا ہے اور امتِ مسلمہ کو بمنزلہ ایک جسم کے قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور کمال کو پہنچ جائے اس میں ایسے لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہوں تو آیت میں مومنوں کے لیے تسلی ہے کہ جب تم ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم ہو تو تم کو ان لوگوں سے مضرت کا اندیشہ نہیں جنہوں نے بھٹک کر سیدھا راستہ چھوڑ دیا۔

نیز اصل ہدایت یہ ہے کہ انسان شریعتِ محمدیہ کو مع تمام احکام کے قبول کرے اور منجملہ خداوندی احکام کے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے۔

عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ قَالَ
أَيُّهَا النَّاسُ أَمُّكُمْ تَقْرُدُونَ
هَذِهِ الْآيَةُ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ
لَا يَفْتَرِّكُمْ مَنْ ضَلَّ
إِذَا اهْتَدَيْتُمْ فَلَمَّا سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ النَّاسَ
إِذَا مَرَأُوا أَلْمَنُوكُمْ فَلَمَّ

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا۔ اے لوگو! تم یہ آیت یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یفترکم من ضل اذا اہتدیتم دیکھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ خلافِ شرع کسی چیز کو دیکھیں اور اس میں تغیر نہ کریں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے عمومی عذاب میں

يُعَذِّبُوهُ اَوْ شَكَ اَنْتَ مُبْتَلَا فَرَاوَدَ۔

يُعَذِّبُهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ

علماء محققین نے بھی آیت کے یہی معنی لیے ہیں۔ امام نووی شرح مسلم میں

فرماتے ہیں :-

”علماء محققین کا صحیح مذہب اس آیت کے معنی میں یہ ہے کہ جب تم

اس چیز کو ادا کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تو تمہارے غیر کی کوتاہی

تمہیں مضرت نہ پہنچائے گی جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ

وَاثْرَہٗ وَلَا تَحْزَنُ اَوْ جِب اِذَا جِب اِلَیْہَا ہُوَ تَمَجْلِدُ اِنْ اَشِیَا رَہُ کَہ جَن کَا

حکم دیا گیا امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے پس جب کسی شخص نے اس

حکم کو پورا کر دیا اور مخاطب نے اس کی تعمیل نہ کی تو اب ناصح پر کوئی

عتاب اور سرزنش نہیں، اس لیے کہ جو کچھ اس کے ذمہ واجب تھا

وہ امر ونہی ہے اس نے اس کو ادا کر دیا۔ دوسرے کا قبول کرنا اس کے

ذمے نہیں۔ واللہ اعلم۔“

تیسری وجہ یہ ہے کہ عوام و خواص، عالم و جاہل، شخص اصلاح سے مایوس ہو گیا

اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں کی ترقی اور ان کا عروج ناممکن اور دشوار ہے جب

کسی شخص کے سامنے کوئی اصلاحی نظام پیش کیا جاتا ہے تو جواب یہی ملتا ہے، کہ

مسلمانوں کی ترقی اب کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ان کے پاس نہ سلطنت و حکومت ہے

نہ مال و زر اور نہ سامان حرب اور نہ مرکزی حیثیت، نہ قوت بازو، اور نہ باہمی

اتفاق و اتحاد۔

بالخصوص دیندار طبقہ تو بزم خودیہ طے کر چکا ہے کہ اب چودھویں صدی ہے

زمانہ رسالت کو بعد ہو چکا۔ اب اسلام اور مسلمانوں کا انحطاط ایک لازمی شے ہے،

پس اس کے لیے جدوجہد کرنا عبث اور بیکار ہے۔ یہ سچ ہے کہ جس قدر مشکوۃ نبوت

سے بعد ہوتا جائے گا حقیقی اسلام کی شعا عین ماند پڑتی جائیں گی لیکن اس کا مطلب

ہرگز نہیں کہ بقا شرعی اور حفاظت دین محمدی کے لیے جدوجہد اور سعی نہ کی جائے

اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا اور ہمارے اسلاف بھی خدا نخواستہ یہی سمجھ لیتے تو آج ہم تک اس دین کے پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی البتہ جب کہ زمانہ ماضی ہے تو زمانہ گزشتہ دیکھتے ہوئے زیادہ ہمت اور راست قیال کے ساتھ اس کام کو لبیکر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ جو مذہب سر اسر عمل اور جدوجہد پر مبنی تھا۔ آج اس کے پیرو عمل سے یکسر خالی ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں جگہ جگہ عمل اور جدوجہد کا سبق پڑھایا اور بتلایا ہے کہ ایک عبادت گزار تمام رات نفل پڑھنے والا، دن بھر روزہ رکھنے والا، اللہ اللہ کرنے والا ہرگز اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جو دوسروں کی اصلاح اور ہدایت کی فکر میں بے چین ہو۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ جہاد فی سبیل اللہ کی تاکید کی اور مجاہد کی فضیلت اور برتری کو نمایاں کیا۔

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَبِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكَذَلِكَ وَعَدَ اللَّهُ الْمُحْسِنِينَ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا دَرَجَتٍ مِنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَرَحْمَةً وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (نساء ۷۴)

برابر نہیں وہ مسلمانوں جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کریں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بلند کیا ہے جو اپنے مال و جان سے جہاد کرتے ہیں بنسبت گھر بیٹھے والوں کے اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو مقابلہ گھر میں بیٹھے والوں کے اجر عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت، اور اللہ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اگرچہ بہت میں جہاد سے شر و کفار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن اگر بد قسمتی سے آج ہم اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہیں تو اس مقصد کے لیے جس قدر جدوجہد ہماری

مقدرت اور استطاعت میں ہے۔ اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔ پھر ہماری یہی معمولی حرکت عمل اور جدوجہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی وَالَّذِينَ جَاهَلُوا فِينَا لَنَهْدِيَهُمْ صُبُلَنَا۔ یعنی جو لوگ ہمارے دین کے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے محصول دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دین محمدی کی بقا اور تحفظ کا حق تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، لیکن اس کے لیے ہمارا عمل اور سعی مطلوب ہے۔ صحابہ کرام نے اس کے لیے جس قدر انتھک کوشش کی اسی قدر ثمرات بھی مشاہدہ کیے اور غلبی نصرت سے سرفراز ہوئے، ہم بھی ان کے نام لیا ہیں اگر اب بھی ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعت اسلام کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو یقیناً ہم بھی نصرت خداوندی اور امداد غیبی سے سرفراز ہوں گے اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُخْرِجْ اَمْكُكُمْ یعنی اگر تم خدا کے دین کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھنے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ان باتوں کے پابند نہیں اور اس منصب کے اہل نہیں تو دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کریں لیکن یہ نفس کا صریح و صوحہ کہ ہے جب ایک کام کرنے کا ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے ہم اس کے مامور ہیں تو پھر ہمیں اس میں پس و پیش کی گنجائش نہیں۔ ہمیں خدا کا حکم سمجھ کر کام شروع کر دینا چاہیے۔ پھر انشاء اللہ یہی جدوجہد ہماری یختگی، استحکام اور استقامت کا باعث ہوگی اور اسی طرح کرتے کرتے ایک دن تقرب خداوندی کی سعادت نصیب ہو جائے گی یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے کام میں جدوجہد کریں اور دو رحمن و رحیم ہماری طرف نظر کر رہے نہ فرمائے۔ میرے اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم بھلائیوں کا حکم نہ کریں جب تک خود تمام پر عمل نہ کریں اور برائیوں سے منع نہ کریں جب تک خود تمام برائیوں سے نہ بچیں حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں بلکہ تم بھلی باتوں کا حکم کرو اگرچہ تم خود ان سب کے پابند نہ ہو اور برائیوں سے منع کرو اگرچہ تم خود ان سب سے نہ بچ رہے ہو۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا نَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ حَتَّى نَعْمَلَ بِهِ كُلُّهُ وَلَا نَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ حَتَّى نَجْتَنِبَهُ كُلُّهُ فَقَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ مُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَإِنْ لَمْ تَعْمَلُوا بِهِ كُلُّهُ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَإِنْ لَمْ تَجْتَنِبُوهُ كُلُّهُ (رواه الطبرانی في الصغير الاوسط)

پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ جگہ جگہ مدارس وینیہ کا قائم ہونا، علماء کا وعظ و نصیحت کرنا، خالقا ہوں کا آباد ہونا، مذہبی کتابوں کا تصنیف ہونا۔ رسالوں کا جاری ہونا، یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبے ہیں اور ان کے ذریعہ اس فریضہ کی ادائیگی ہو رہی ہے اس میں شک نہیں کہ ان سب اداروں کا قیام اور بقا بہت ضروری ہے اور ان کی جانب اعتناء اہم امور سے ہے اس لیے کہ دین کی جو کچھ ٹھوٹی بہت جھلک دکھائی دے رہی ہے وہ انہی اداروں کے مبارک آثار ہیں لیکن پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری موجودہ ضرورت کے لیے یہ ادارے کافی نہیں اور ان پر اتکفاء کرنا ہماری کھلی غلطی ہے اس لیے کہ ان اداروں سے ہم اس وقت منتفع ہو سکتے ہیں جب ہم میں دین کا شوق اور طلب ہو اور مذہب کی وقعت اور عظمت ہو، اب سے پچاس سال پہلے ہم میں طلب اور شوق موجود تھا اور ایمانی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے ان اداروں کا قیام ہمارے لیے کافی تھا لیکن آج غیر اقوام کی انتھک کوششوں نے ہمارے اسلامی جذبات بالکل فنا کر دیئے اور طلب و رغبت کے بجائے آج ہم مذہب سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مستقل کوئی تحریک ایسی شروع کریں جس سے

عوام میں دین کے ساتھ متعلق اور شوق و رغبت پیدا ہو اور ان کے سونے ہوئے جذبات بیدار ہوں، پھر ہم ان اداروں سے ان کی شان کے مطابق منفعہ ہو سکتے ہیں ورنہ اسی طرح اگر دین سے بے رغبتی اور بے اعتنائی برپا ہوتی گئی تو ان اداروں سے انتفاع تو درکنار ان کی بقا بھی دشوار نظر آتی ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ جب ہم اس کام کو لے کر دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو وہ بری طرح پیش آنے ہیں اور سختی سے جواب دیتے ہیں اور ہماری توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کام انبیاء کرام کی نیابت ہے اور ان مصائب اور مشقتوں میں مبتلا ہونا اس کام کا خاصہ ہے اور یہ سب مصائب و تکالیف بلکہ اس سے بھی زائد انبیاء کرام نے اس راہ میں برداشت لیں بحق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ
وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا
كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۚ هَجَرَ

ہم بھیج چکے ہیں رسول تم سے پہلے اگلے
لوگوں کے گروہوں میں اور ان کے
پاس کوئی رسول نہیں آیا تھا، مگر یہ اس
کی ہنسی اڑاتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد ہے دعوتِ حق کی راہ میں جس قدر مجھ کو اذیت اور تکلیف میں مبتلا کیا گیا ہے، کسی نبی اور رسول کو نہیں کیا گیا۔

پس جب سردارِ دو عالم اور ہمارے آقا و مولے نے ان مصائب اور مشقتوں کو تحمل اور بردباری کے ساتھ برداشت کیا تو ہم بھی ان کے پیرو ہیں اور انہی کا کام لے کر کھڑے ہوئے ہیں ہمیں بھی ان مصائب سے پریشان نہ ہونا چاہیے، اور تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

ما سبق سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض رُوحِ اسلامی اور حقیقتِ ایمانی کا ضعف اور اضمحلال ہے ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے اور ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی اور جب اصل شے میں انحطاط آ گیا تو اس کے ساتھ جتنی خوبیاں اور بھلائیاں وابستہ تھیں ان کا انحطاط پذیر ہونا بھی لازمی اور ضروری تھا

اس ضعف اور انحطاط کا سبب اس اصل شے کا چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقا اور دار و مدار ہے اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد خرمیوں اور کمالات سے آراستہ نہ ہوں۔

پس ہمارا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوتِ ایمانی بڑھے اور اسلامی جذبات ابھریں۔ ہم خدا اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکامِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوں اور اس کے لیے ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو سید الانبیاء والمرسلینؑ نے مشرکین عرب کی اصلاح کے لیے اختیار فرمایا:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ
میں اچھی پیروی ہے۔

اسی کی جانب امام مالک رضی اللہ عنہ اشارہ فرماتے ہیں لَنْ يُصْلِحَ الْاِخْرَ
هَذِهِ الْاُمَّةُ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّلُهَا یعنی اس امت محمدیہ کے آخر میں آنے والے
لوگوں کی ہرگز اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس نے ابتداء
میں اصلاح کی ہے۔

جس وقت نبی کریمؐ دعوتِ حق لے کر کھڑے ہوئے، آپ تنہا تھے، کوئی آپ کا
ساتھی اور ہم خیال نہ تھا، کوئی دنیوی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی، آپ کی قوم میں خود سری
اور خود رانی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، ان میں سے کوئی حق بات سننے اور اطاعت
کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ بالخصوص جس کلمہ حق کی آپ تبلیغ کرنے کھڑے ہوئے تھے اس
سے تمام قوم کے قلوب متنفر اور بیزار تھے، ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے
ایک مفلس و نادار اور بے یار و مددگار انسان نے تمام قوم کو اپنی طرف کھینچا، اب غور
کیجئے کہ وہ آخر کیا چیز تھی جس کی طرف آپ نے مخلوق کو بلایا اور جس شخص نے اس چیز کو پا
لیا وہ پھر ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو رہا، دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک سبق تھا، جو
آپ کا مطمح نظر اور مقصود اصلی تھا جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت
نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو
شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے
کوئی دوسرے کو رب نہ قرار دے،
خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

أَلَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا
تُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
أُمَمًا بَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ط
(آل عمران ع ۴)

اللہ وحدہ لا شریک لہ کے سوا ہر شے کی عبادت اور اطاعت اور فرمانبرداری
کی ممانعت کی اور اختیار کے تمام بندھنوں اور علاقوں کو توڑ کر ایک نظام عمل مقرر
کر دیا اور بتلادیا کہ اس سے بہت کر کسی دوسری طرف رُخ نہ کرنا۔

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن
رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِمَّنْ
دُونَهُ أَوْلِيَاء ط
(اعراف ع ۱۶)

یہی وہ اصل تعلیم تھی جس کی اشاعت کا آپ کو حکم دیا گیا۔
اتباع مت کرو۔

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ
بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ
الْحَسَنَةِ وَجَاوِزْهُمْ بِاتِّ
هِى أَحْسَنُ ط إِنَّ رَبَّكَ
هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ
عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ
بِالْمُهْتَدِينَ ه (نمل ع ۱۶)

اے محمد! بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کے
راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت
سے اور ان کے ساتھ بحث کرو جس طرح
بہتر ہو، بیشک تمہارا رب ہی خوب جانتا
ہے اس شخص کو جو گمراہ ہو اس کی راہ
سے وہی خوب جانتا ہے راہ چلنے
والوں کو۔

اور یہی وہ شاہراہ تھی جو آپ اور آپ کے ہر پیرو کے لیے مقرر کی گئی۔
قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو
إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا
وَمَنِ اتَّبَعَنِي ط وَسُبْحَانَ

کہہ دو یہ ہے میرا راستہ، بلا تاہوں، اللہ
کی طرف سمجھ بوجھ کر، میں اور جتنے میرے
تابع ہیں وہ بھی، اور اللہ پاک ہے، اور

میں شریک کرنے والوں میں سے
نہیں ہوں۔

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے
جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل
کریں اور کہے میں فرمانبرداروں میں
سے ہوں۔

اللّٰهُ وَمَا آتَا مِنْ
الْمُشْرِكِينَ (یسف ع ۱۲)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ
دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا

وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

(احم سجدہ - ع ۴)

پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مخلوق کو بلانا، جھٹکے ہوؤں کو راہ حق دکھانا، گمراہوں
کو ہدایت کا راستہ دکھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفہ حیات اور آپ کا مقصد
اصلی تھا اور اسی مقصد کی نشوونما اور آبیاری کے لیے ہزاروں نبی اور رسول
بھیجے گئے۔

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی
رسول مگر اس کی جانب بھی جی بھیجتے
تھے کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے، پس
میری بندگی کرو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا لِيُحْيِيَ النَّاسَ
أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا
فَاعْبُدُونِ (الانبیاء ع ۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ویجاہ انبیاء کریم کے مقدس لمحات
زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین
صرف ایک ہے، اور وہ اللہ رب العالمین وحدہ لا شریک لہ کی ذات و صفات
کا یقین کرنا یہی ایمان اور اسلام کا مفہوم ہے اور اسی لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا،
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ یعنی ہم نے جنات اور انسان
کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ بندہ بن کر زندگی بسر کریں۔

اب جبکہ مقصد زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے معالجہ کی نوعیت
معلوم ہو گئی تو طریق علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور اس نظر سے
کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاء اللہ نافع اور سودمند ہو گا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکر امت کے فیہم غاصرین تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک بن جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ